ماہنامہ

ندائے اعتدال

علی گڑھ

مارچ ۲۰۲۲ء | جلد نمبر ۱۳ | شمارہ نمبر ۹ | شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی

(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس ادارات

- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- مولانا محمد قمر الزماں ندوی
- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپئے
سالانہ:	250:00 روپئے
سالانہ اعزازی ممبر شپ:	500:00 روپئے
بیرونی ممالک:	$30 ڈالر
لائف ممبر شپ (۲۰ سال):	4000:00 روپئے

Bank Acount Detail:
Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road,
Aligarh-202002
Mob. 9808850029

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری ندوی 9808850029

محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and Composed By, MD Hifzur Rahman Nadwi, Mob No 9528097025

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد انصاری ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	انصاف کے گواہ بن جاؤ	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
۲۔	اداریہ	ملی مسائل اور مثبت ومنفی رویّوں کے نتائج	مدیر	۳
۳۔	قرآنی تعلیمات	قضیۂ حجاب اور قرآن کریم کی راست رہنمائی	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۷
۴۔	گوشۂ عبادت	دعا مانگنا اللہ کی رحمت وقربت.....کا بہترین وسیلہ	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۱۴
۵۔	تحقیق وتنقید	اہلِ کتاب کے کفر کے اسباب (قسط-۳)	مولانا محمد غزالی ندویؒ	۱۹
۶۔	تجزیہ	دورِ حاضر میں اسلامی فکر: توجہ طلب پہلو	ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی	۲۸
۷۔	// //	اسلامی تحریک سیاسی تحریک ہے یا اصلاحی؟ (قسط-۲)	ترجمہ: محمد فرید حبیب ندوی	۳۶
۸۔	افکار ونظریات	مخلوط تعلیم	خالد سیف صدیقی	۴۲
۹۔	دعوتِ فکر وعمل	تاریخ کا سبق اور وقت کا تقاضا	انس مسرور انصاری	۴۵
۱۰۔	ذکر سلف	بے محنت پیہم	محمد سراج اکرم قاسمی	۵۱
۱۱۔	تشخیص وعلاج	امت مسلمہ کے مہلک امراض (قسط-۱)	محمد سہیل ندوی	۵۵
۱۲۔	مطالعۂ کتب	کتاب التجرید لابی الحسن القدوری-ایک تجزیاتی مطالعہ	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۵۹
	گوشۂ ادب	غزل	قتیل شفائی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

ملی مسائل اور مثبت ومنفی رویّوں کے نتائج

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک بڑی تیزی کے ساتھ فسطائیت کی طرف بڑھ رہا ہے، بھگوا آتنک اپنے شباب پر ہے، شریف لوگوں کے لیے راہ چلنا دشوار ہوگیا ہے، تناؤ سے بھرپور ماحول کو فروغ دیا جارہا ہے، نفرت کی کھیتی کی جارہی ہے، زعفرانی سیاست اس کھیتی کو سینچنے میں مصروف ہے، اس صورت حال میں جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ ہے جائز اور مثبت ردعمل کا یکسر فقدان اور منفی ردعمل کی بڑھتی ہوئی نفسیات۔ ایجابی ردعمل اور مثبت اقدام کے فقدان نے ملت کے نوجوانوں کی بڑی تعداد کو ذہنی تناؤ (Frustration) کا شکار بنادیا ہے، منفی سوچ کا عادی بنادیا ہے، جس کے نتیجے میں انھیں نہ کوئی انسان مثبت نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ واقعات وحوادث سے مثبت نتائج اخذ کرپاتے ہیں۔

موقع پر نہ بولنا ظلم ہے، بزدلی ہے، ملت کے ساتھ ناانصافی ہے، جہاں بولنا ضروری ہو وہاں ہونٹ سی لینا ایسا جرم ہے جس کو تاریخ کبھی نہیں معاف کرتی، بلکہ جس قوم میں یہ مرض سرایت کرجائے اس کو تاریخ داستان عبرت بنادیتی ہے، لیکن جب موقع پر جنہیں بولنا چاہئے وہ صحیح موقف کا اظہار نہیں کرتے تو پھر ان لوگوں کو بولنے کا موقع ملتا ہے جن کے لئے موقع بے موقع بولنا ضروری ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ بے موقع، بے محل اور بے جا بولنا بھی جرم ہے، اور ان دونوں جرموں کا انجام بھیانک ہی ہوتا ہے، اگر کوئی صرف بولنے کو ہی ہر مسئلہ کا حل سمجھتا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے، کب بولنا ہے، کیا بولنا ہے، کیسے بولنا ہے یا پھر چپ رہنا ہے، جو شے اس کی تمیز پیدا کرتی ہے اسی کو حکمت وفراست سے موسوم کیا جاتا ہے، ہاں کوئی اگر مسائل کو ٹالنے، جان بچانے، پہلوتہی برتنے اور یکسر ہونٹ سی لینے کو حکمت وفراست سمجھتا ہے تو یہ حکمت وفراست نہیں، حماقت وبزدلی بلکہ مردہ دلی ہے، اسی پہلوتہی، مردہ دلی اور بزدلی کے نتیجے میں معاشرے میں منفی سوچ فروغ پارہی ہے، منفیت (Nigativity) کا رجحان انتہائی خطرناک ہے، ملت کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے، یہ رجحان اچھے خاصے لوگوں کو ناکارہ کردیتا ہے، منفیت جمود وتعطل کے بطن سے پیدا ہوتی ہے، پھر اس حقیقت کو سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے کہ جمود وتعطل یا ظلم وجبر کا مقابلہ بہرحال منفیت وجذباتیت کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا، یہ ایک قسم کا مرض ہے۔ اگر یہ جڑ پکڑ لیتا ہے تو اپنے سوا ہر شخص احمق اور دشمن نظر آنے لگتا ہے، ہر شخص مشکوک نظر آتا ہے، منفی سوچ اور جذباتیت جس کے اندر پیدا ہوجائے اسے ہمہ وقت بے چین ومضطرب رکھتی ہے، اس کا معاشرے میں رہنا دشوار ہوجاتا ہے، وہ بہت مشکل سے تعلقات نبھا پاتا ہے، دھیرے دھیرے ذہنی طور پر بیمار ہوجاتا ہے، ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے، خودکشی کرلیتا ہے یا ہر

پل گھٹ گھٹ کر مرتا ہے، یا ایسے اقدام کر بیٹھتا ہے جو اسکی زندگی ہی تاراج کر دیتا ہے، ہر وقت اپنے ہی الجھائے ہوئے دھاگوں کی گتھیاں سلجھاتا رہتا ہے، دنیا اس کو اپنے معہود ذہنی (Self made Mindset) کے مطابق نظر آتی ہے، طرفہ یہ کہ اس صورت حال سے نمٹنے اور اسے تبدیل کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی ٹھوس لائحہ عمل نہیں ہوتا، وہ ہوائی فائرنگ کرتا ہے یا جذباتی ردعمل اور ماتم کرتا ہے یا ناقابل عمل تھیوریز پیش کرتا ہے۔

اس کے برخلاف مثبت سوچ کا حامل شخص ہر طرف پھیلے ہوئے موت کے مناظر سے بھی مثبت نتائج نکال لیتا ہے، اس کے اندر حالات کو سنبھالا دینے کی فکر ہوتی ہے، اس کی نظر نسلوں کے مستقبل پر ہوتی ہے، اس کی سوچ تعمیری ہوتی ہے، وہ زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتا ہے، اسی لئے وہ خطرات کا ادراک کرتا ہے، ان سے بچنے کے لئے درست سمت میں سوچتا ہے، بروقت اور مبنی برحقائق فیصلے کرتا ہے، منفی اور مشکل ترین حالات سے مثبت نتائج نکالتا ہے، سچی بات یہ ہے کہ تاریخ میں جتنی شخصیات بھی آئیڈیل قرار پائی ہیں ان کی زندگیاں مثبت سوچ، مثبت کردار، اور مثبت عمل سے عبارت ہیں، کیونکہ منفی سوچ کے ساتھ دیر تک اور دور تک چلا ہی نہیں جا سکتا، کوئی بڑا تعمیری کام انجام دیا ہی نہیں جا سکتا، یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مثبت سوچ کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ حرکت سے مستغنی ہو کر جمود و تعطل کو شعار بنا لیا جائے، خطرات کو نظر انداز کیا جائے، دشمن کو دشمنی نبھانے کے مواقع دئے جائیں اور اسے آزاد چھوڑ دیا جائے، غلط فکر اور غلط عمل اور غلط اقدام پر تنقید نہ کی جائے، بلکہ مثبت فکر کا مطلب یہ ہے کہ مشکلات کے مقابلے لئے ٹھوس لائحہ عمل پیش کیا جائے، ہمہ وقت حرکت و عمل اور نشاط ہو، ہر آن ایجابی و تعمیری اور اصلاحی ہدف پیش نظر ہو، ہر تنقید و تعاقب صرف ملی فلاح و بہبود کے لئے ہو۔

حالیہ دنوں میں کچھ واقعات کے تناظر میں دیکھیے کہ ہمیں مثبت رویّوں کے فقدان اور ارباب ملت و اصحاب وسائل کی سرد مہری اور منفیت و جذباتیت اور ردعمل کی نفسیات کے شکار لوگوں نے کس طرح نقصان پہنچایا ہے۔

ریاست کرناٹک کے ایک نسواں کالج میں حجاب کا مسئلہ پیش آیا، اسکول کے کیمپس میں حجاب کے ساتھ آنے کی اجازت تھی، لیکن پھر کلاس روم میں بھی حجاب پہننے کا کچھ طالبات نے مطالبہ کیا، پرنسپل نے مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، بات کچھ آگے بڑھی تو کچھ مقامی لوگوں کی مداخلت سے یہ بات طے پائی کہ اسکول میں حجاب پہننے سے کوئی روکتا نہیں اور گرلس کالج ہونے کی وجہ سے کلاس روم میں پہننے کے مطالبہ سے دست بردار ہو جانا چاہیے، بات ختم ہوگئی، پھر ایک تنظیم نے طالبات اور ان کے گھر والوں سے رابطہ کیا اور کہا کہ ہم کورٹ جائیں گے اور احتجاج کریں گے، فیصلہ انشاء اللہ ہمارے حق میں آئے گا، (میں تنظیم کا نام قصداً نہیں لکھ رہا ہوں اس لئے کہ متعدد تنظیمیں ایک دوسرے پر الزام لگا رہی ہیں) البتہ اتنی بات طے ہے کہ اس مسئلہ کو گرمانے میں ایک تنظیم کی ناعاقبت اندیشی کا دخل ہے، وہی اس قضیہ کو عدالت لے گئی اور اب ایک دستوری آزادی عدالت کی تشریح کے رحم و کرم پر معلق ہے، داد شجاعت حاصل کرنے والی مسکان کے ویڈیو سے آپ نے اتنا تو سمجھ ہی لیا ہوگا کہ وہ بیٹی کسی تنظیم کی تربیت یافتہ ہے، جس کا شعور بیدار ہے، ورنہ عام لڑکی ان بھگوائیوں کی بھیڑ کے سامنے اس طرح نہیں ڈٹ سکتی تھی، بہر حال احتجاج شروع ہوا تو پھر ایک کالج سے دوسرے کالجوں تک پہنچا، ایک ریاست سے دوسری ریاستوں تک پہنچا، بھگوائی سیاست کے علمبردار نفرت

کوفروغ دینے والے ہر موقع کے انتظار میں رہتے ہی ہیں، چنانچہ پھر کھیل شروع ہوا نفرت کی سیاست کا۔

اب یہ موقع تھا کہ قیادتیں سرگرم عمل ہوجاتیں، مثبت اقدامات کرتیں، فوری طور پر قضیہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بروقت گفت وشنید یا مناسب اقدامات کے ذریعہ حل کرلیتیں، لیکن ماضی کی طرح اس مرتبہ بھی مایوسی ہوئی، رہ گئی منفیت وجذباتیت تو اس نے اس قضیہ کو گرمانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جن ریاستوں میں یہ قضیہ نہیں چھڑا تھا وہاں بھی پہنچا دیا گیا، ایک ناعاقبت اندیش سیاست داں، بزعم خود مسلمانوں کے ''تنہا مسیحا'' اور بقول خود ''مجاہد'' نے تو اس قضیہ کو بالکل ہی دوسرا رخ دے دیا، اس کے منہ سے نکلے ہوئے جملے ''حجابی وزیراعظم'' نے یوگی جیسے بدطینت کو غزوۂ ہند کی بحث چھیڑنے کا موقع دے دیا، یہی ہماری ملی شناخت ہے، ہم ہمیشہ یہی غلطی کرتے ہیں کہ کسی بھی مسئلہ کی گہرائی میں نہیں جاتے، کبھی نہیں سوچتے کہ آخر یہ مسئلہ کیوں پیدا ہوا، کیسے ہوا، اس کو عدالت لے جانے یا سڑکوں پر لانے سے کس کو فائدہ حاصل ہوگا، تین طلاق کے مسئلہ میں جو غلطی ہوئی اس سے ہم نے کچھ نہیں سیکھا اور اب حجاب کا قضیہ بھی مسلط ہوگیا، پانچ ریاستوں میں ہونے والے انتخابات کو متاثر کرگیا، بی جے پی کی ڈوبتی کشتی کو بہرحال سہارا دے گیا۔

قابل فخر بیٹی مسکان کا انٹرویو، غور سے سنیے، اسکے جوابات واعترافات میں ہم سب کے لیے لائن آف ایکشن ہے، اور اس ملک میں رہنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کس رخ پر محنت کرنے کی ضرورت ہے اسکی واضح رہنمائی ہے، یہ نتیجہ آپ اس انٹرویو سے اخذ کرسکتے ہیں، ہمیں اس ملک میں رہنا ہے تو سروائیول (Survival) کے لیے محنت بھی کرنی ہوگی، ہندو اور ہندتوا کو نہ صرف سمجھنا ہوگا بلکہ لوگوں کو سمجھانا ہوگا، لڑکی صاحب معاملہ ہے اسکے جوابات اہمیت کے حامل ہیں، کرایے کی بھیڑ اور غنڈوں کے جھنڈ پر جذباتی فیصلے نہیں کیے جاسکتے، آپ سوچیے کہ منافرت کے بیج بونے کی جو شروعات کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے جدوناتھ سرکار جیسے مصنفین کے ذریعہ ہوئی تھی وہ آج کہاں تک پہنچی ہے، اس منافرت پر قابو پانے کے لیے ۱۹۷۵ (تاریخ صحیح یاد نہیں اس وقت) میں پارلیمنٹ کا ایک سیشن بلایا گیا تھا جسمیں مورخ بی این پانڈے کی تقریر بڑی اہم تھی، آج اس منافرت کو فروغ دینے میں گودی چینلز کے علاوہ واٹساپ نے بڑا کردار ادا کیا ہے، روز صبح کوئی ہندو اٹھتا ہے تو مس گائیڈ اور مس کنسپشن والی کوئی ویڈیو دیکھتا ہے، دیکھتے دیکھتے آخر کیا ہوگا، وہی ہوگا جو اس وقت ملک کا منظرنامہ ہے، سوال یہ ہیکہ ہم بھڑکنے اور غصہ نکالنے کے علاوہ عملاً کیا کرتے ہیں، ایک آدھ یکجہتی کے جلسے، اسٹیج شیئر، کرایے کے ہندو نعت خواں اور بس!

کیا مس کنسپشن پھیلانے والوں کے خلاف ہمارا کوئی متحرک ادارہ ہے، کیا منافرت کے مقابلے کے لیے ہم صحیح مواد پھیلاتے ہیں، کیا کبھی ہم نے سوچا کہ واٹساپ یونیورسٹی کی گیان بازی کا مقابلہ بہت ضروری ہے، ورنہ زہر گھر گھر سرایت کرجائے گا، کیا اسلام کی، اور مسلم بھارت کی درست تصویر والی ویڈیوز ہم ہندوؤں تک پہنچاتے ہیں، کیا اپنے پاس پڑوس کے ہندوؤں سے ہمارا رابطہ ہے، کیا کبھی ہم نے ایک دو ہندوؤں کا ذہن بدلنے کی سنجیدہ کوشش کی، کیا دو قوموں کے بلکہ دو پڑوسیوں کے درمیان گیپ اور باہمی گفت وشنید کا فقدان (Lake of Communication) بجائے خود منافرت اور غلط فہمیوں کی ایک بڑی وجہ نہیں ہے، کیا اسکو کم کرنے کی ہم عملی کوشش کرتے ہیں، دشمن نے اپنی فصل کاٹنے کے لیے دن رات محنت کی، ہم اگر اقلیت میں

تھے اور صاحب پیغام اقلیت تھے تو ہم نے اسی انداز میں دشمن کی کوششوں کو ناکام کرنے کی کتنی سنجیدہ کوششیں کیں؟

یاد رکھیے یہیں رہنا ہے اور اپنے پورے تشخص کے ساتھ رہنا ہے، اگر یہ عزم ہے تو پھر اسکے لیے تعمیری لائحہ عمل طے کرنا ہوگا اور اس پر سنجیدہ عمل درآمد کرنا ہوگا، تاریخ میں کام چور، فرائض منصبی سے فرار اختیار کرنے والی، مضطرب اور نعرے باز قوم کے لیے کوئی جگہ نہیں، تاریخ میں عملی جدوجہد کرنے والے ہی باعزت مقام پاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ اگر ہم جذبات کی رو میں بہتے رہے اور ہوش وحواس میں سوچنے اور دشمن کی چالوں پر گہرائی سے سوچنے کی عادت نہیں ڈالی تو کبھی اس ملک کے اقتدار میں شراکت نہ مل سکے گی، بلکہ زندگی صرف مزاحمت ودفاع میں گزرے گی، کبھی بحیثیت قوم باعزت شہری ہونے کا اعزاز بھی نہ مل سکے گا، حالیہ انتخابات کے دوران کچھ اسی طرح کی غلطیاں دوہرائی گئیں، ہم تو کشتیاں جلانے کا حوصلہ رکھتے ہیں، ملاحوں کی بھیڑ جمع کرنے اور تعلقات بڑھانے کی سوچ سے بحمد اللہ آزاد رہتے ہیں، اس لئے خدا سچ لکھوا دیتا ہے، فوری طور پر تو بڑی گالیاں ملتی ہیں لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کا نشہ اترتا ہے تو سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں، جب ایک روز شام کو ایک سیاسی رہنما پر ایک ڈرامائی حملہ ہوا تو سوشل میڈیا پر ایک طوفان کھڑا ہوگیا، ہم رات بھر سوچتے اور دیکھتے رہے، جس قدر اور جس پہلو سے بھی ممکن تھا جائزہ لیتے رہے بالآخر صبح کو ہم نے لکھ دیا کہ یہ حملہ تو تھا، مگر قاتلانہ نہیں تھا، اس حملہ کا مقصد قتل کرنا نہیں تھا، حملے کا اسکرپٹ کس نے لکھا نہیں معلوم! البتہ جس نے بھی اسکرپٹ لکھا بہت کمزور لکھا، اسکرپٹ میں بڑے جھول تھے، غالب گمان یہی تھا کہ یہ اسکرپٹ زعفرانی پارٹی نے لکھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ جس پر حملہ ہوا اسے معلوم تھا کہ نہیں، تاہم ملزم، پولس اور جس پر حملہ ہوا اس کے بیانات میں کھلے ہوئے تضادات سامنے آئے، حملے کی ویڈیو مکمل طور پر ڈرامائی حملہ کی کہانی سنا رہی تھی، لیکن فوری طور پر بھاجپا اس حملہ کے ذریعہ ''ہندو ہردیہ سمراٹ'' کا پیغام دینے اور مسلمانوں کے ایک طبقے کی ہمدردی ''حضرت نقیب ملت'' کے نام کرنے میں کامیاب ہوگئی، اس کا اثر ووٹ پر کتنا پڑا یہ دس مارچ کو ہی معلوم ہوگا، لیکن کاش مومنانہ فراست کے ساتھ لوگ مسائل کی تہہ میں جا کر سوچنے کی عادت ڈالتے تو فوری طور پر ہونے والے اس طرح کے ردعمل کے نقصانات سے ملت محفوظ رہتی، پھر ٹھوس منصوبے، منظم لائحہ عمل اور حکمت آمیز رویّے وجود میں آتے، جن کے نتائج دیرپا اور دوررس ہوتے۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

☆☆☆

❑ قرآنی تعلیمات

قضیۂ حجاب اور قرآن کی راست رہنمائی

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

ملک میں اس وقت قضیۂ حجاب پر بحث جاری ہے، اس سلسلے میں جن لوگوں کو درست رہنمائی کرنی تھی وہ ان مقامات پر پہنچ کر درست رہنمائی نہیں کر پا تیجہاں کرنا چاہئے، بلکہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اسلامی احکام و تعلیمات کی غلط تشریحات کی جاتی ہیں، بے بنیاد باتیں عام ہوجاتی ہیں، جو لوگ درست موقف بیان کرنے کے اہل ہوتے ہیں وہ یا تو پیچھے رہتے ہیں یا گریز کرتے ہیں، پردہ ان ہی احکام میں سے ہے، جس کے متعلق بڑی غلط فہمیاں عام ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مسلم عورتوں پر پردہ مسلط کیا جاتا ہے، انہیں پردے میں قید کیا جاتا ہے، پردے کے نام پر ان کی آزادی چھینی جاتی ہے، خود مسلمان مرد و عورت یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ پردہ خود ہماری اپنی پسند ہے، ہم چاہیں تو کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں، یہ نظریہ بھی قطعاً درست نہیں ہے کیوں کہ پردہ خواہش و پسند سے پہلے اللہ کا حکم ہے۔

اسی طرح پردے کو تعلیم و ترقی میں مانع سمجھا جاتا ہے، حالانکہ تاریخ اس دعوے کو پورے طور پر خارج کرتی ہے جس کی تفصیل اس مضمون میں مقصود نہیں، با حجاب خواتین کے کارہائے نمایاں سے تاریخ بھری پڑی ہے، ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ ایک زمانے میں تعلیم نسواں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، شرفاء کے یہاں گھریلو ابتدائی تعلیم ہی لڑکیوں کے لئے کافی سمجھی گئی، لیکن اس کا سبب صرف پردہ نہیں بلکہ اس کے بہت سارے معاشرتی اسباب اور رواج تھے، یہ صحیح ہے کہ عورت کے لئے پردہ واجب ہے، اس کے لئے باہر نکلنے میں بہت ساری وہ حدود و قیود ہیں جو مرد کے لئے نہیں ہیں، بلکہ اس کی آواز کو بھی ستر کے دائرے میں لایا گیا ہے، لیکن ان احکامات کو مفسرین و فقہاء نے اپنے اپنے فہم کے مطابق سمجھا ہے اور انسانی ضرورت کے مطابق استنباطات کئے گئے ہیں، جو کج فہم صرف کیڑے نکالتے ہیں وہ تو صرف اعتراض کرتے ہیں، لیکن جو لوگ سمجھنا چاہتے ہیں وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور ان پر ہر حکم اور اس کی حکمت واضح ہوجاتی ہے۔

پردہ ایک اسلامی حکم ہے، یہ واجب ہے، اس کا حکم براہ راست صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں دیا گیا ہے، اس کا انکار گویا قرآن مجید کا انکار ہے، اس کی بہت ساری حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، قرآن مجید میں ایک پاکیزہ اور مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لئے، عفت و عصمت کی حفاظت کے لئے جو احکامات نازل کئے گئے اور جو تعلیمات دی گئیں، ان ہی میں سے ایک حکم پردے کا ہے،

سورہ نور میں انسدادِ فواحش سے متعلق خاص ہدایات دی گئی ہیں، اس لئے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اپنی عورتوں کو سورہ نور کی تعلیم دیا کرو، انسداد وفواحش کے ہی ضمن میں پردے کے احکامات بھی بیان کئے گئے ہیں، گرچہ اس کے ابتدائی احکامات پہلے سورہ احزاب میں نازل کئے جا چکے تھے، یہاں ہم سورہ احزاب کی تین اور سورہ نور کی دو آیتوں کی سادہ اور عام فہم تشریح پیش کر رہے ہیں، اس تشریح میں مشاہدات ومعاصرت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پردہ کے سلسلے میں معتدل نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے، سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (احزاب ۳۲)

(اے نبی کی بیویو تم مقام ومرتبہ میں عام خواتین کی طرح نہیں ہو، اللہ نے تمہیں سیدِ ولدِ آدم فخرِ کائنات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی بنا کر شرف بخشا ہے، تم اگر اللہ سے ڈرتی ہو اور اس کا لحاظ رکھ سکتی ہو تو کسی اجنبی مرد سے ایسے نرم اور لطیف و نازک لہجے میں بات مت کرو، کہ جس کے دل میں روگ وشہوت ہو وہ فوراً فریفتہ ہو جائے، یہ حکم مسلم خاتون کے لیے عام ہے، جب تم بات کرو تو اس طرح کرو کہ نہ کوئی شبہ ہو اور نہ شریعت کی مخالفت ہو، یعنی نہ نرم آواز اور نزاکت بھرا لہجہ ہو اور نہ بھونڈے اور بھدے الفاظ)

اس آیت میں امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو جو ہدایت دی گئی ہے، عام مسلم خواتین اس کی بدرجہ اولیٰ مخاطب ہیں، ''تم عام خواتین کی طرح نہیں ہو'' کا مطلب کوئی الٹا نہ سمجھ لے کہ یہ ہدایات نبی کی بیویوں کے لئے ہیں، عام خواتین تو جو چاہیں کریں، نہیں ہرگز نہیں! کیونکہ نبی کا گھر نزولِ وحی اور نفاذِ شریعت کا گھر ہے، دنیائے انسانیت کے لیے آئیڈیل گھر ہے اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہاری احتیاط عام عورتوں سے زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ تمہاری ذمہ داری بہت بڑی ہے، نرمی ونزاکت اور ناز واندام سے بات نہ کرنے کی قرآنی نصیحت انتہائی بلیغ ہے، بسا اوقات خواتین ایسے ناز ونخرے سے بات کرتی ہیں کہ دیکھنے والے شبہ کرنے لگتے ہیں، خیر آج کے برہنہ دور اور برہنہ تہذیب میں تو کچھ بھی معیوب نہیں رہ گیا، ہر اس جگہ پر جہاں صارف کو سمجھانا اور رام کرنا ہو خواتین کو ہی تعینات کیا جاتا ہے، مقصد صاف اور واضح ہے، استقبالیہ (Receptions) اور کال سینٹر بھرے پڑے ہیں، پھر یہاں سے آگے کے واقعات کا تسلسل اور کثرت خدا کی پناہ، اس پوری داستان کو پڑھیے تو قرآن کے معجزہ ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا، عربی شاعر بشار بن برد نے کہا تھا **الأذن تعشق قبل العين أحيانا**'' کبھی کبھی آنکھوں سے پہلے کانوں کو عشق ہو جاتا ہے'' واقعہ یہ ہے کہ یہ عہد کانوں کے عشق کا ہے، بے حیائی اور عیاشی کا دروازہ آواز اور کانوں سے کھلتا ہے، ایک آواز سن کر شہوت کے بندے آوارہ پاگل ہو جاتے ہیں، بولنا اور بات کرنا انسانی ضرورت کے تحت مجبوری ہے، قرآن نے اس سے منع نہیں کیا بلکہ ہدایت دی کہ ایسی آواز، ایسے کھڑے لہجے اور کھرے انداز میں بات کی جائے کہ نہ کوئی شبہ رہے نہ شیطان کو رس گھولنے کا موقع ملے، بلکہ جواب سن کر ہی سامنے والے کو اندازہ ہو جائے کہ کوئی کھری، با عزت، پاکدامن اور شریف زادی ہے، سمجھنے کی بات یہ ہے کہ نبی کی بیویوں کو اگر ہدایت دی گئی اور چودہ صدیوں قبل

دی گئی تو آج کے اس عہد جدید کی عورت کے لئے اس پر عمل مزید ناگزیر ہے، آج کی مسلم خواتین کو اس پر زیادہ سختی سے عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے، خود کی عصمت اور گھر کی حفاظت کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا ارشاد ربانی یہ ہے:

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا

(احزاب ۳۳)

(اپنے گھروں میں رہو کہ اس میں پردہ اور پاک دامنی ہے، گھروں سے بلاضرورت مت نکلو، زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی طرح زیب وزینت اور فیشن کا اظہار مت کرو، ہمارے عہد کی عورت نے شریعت کی تعلیمات کو چھوڑ کر زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی مشابہت اختیار کی ہے، برہنگی، بے حیائی فیشن اور بے پردگی میں وہ زمانۂ جاہلیت کی عورتوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں، حیا کی چادر اور تقویٰ کا لبادہ اتار کر پھینک دیا ہے، اہتمام کے ساتھ نماز ادا کرو کیونکہ وہ فحش ومنکر سے باز رکھتی ہے، نفس ومال کی تطہیر وپاکیزگی کے لیے زکوۃ ادا کیا کرو، جن کاموں کا اللہ نے حکم دیا ہے انھیں انجام دے کر اور جن سے روکا ہے ان سے باز رہ کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو، اے اہلِ بیتِ نبی اللہ نے تم کو یہ تعلیمات اس لیے دی ہیں کیونکہ وہ تم کو پاک کر دینا چاہتا ہے اور تم کو گناہوں اور گناہ کی گندگیوں اور تمام عیوب ونقائص سے محفوظ کر دینا چاہتا ہے، اے اہل بیت نبی اللہ تمہارے نفوس کو پوری طرح پاک کر دینا چاہتا ہے، تاکہ نبی ﷺ کا گھرانہ دنیا میں سب سے زیادہ پاکیزہ، پاک صاف، باعزت ومحترم گھرانہ ہو، کیونکہ نبی ﷺ خیر کے امام اور انسانیت کے لئے نمونہ ہیں)

اس آیت کے ضمن میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے بڑا اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ ''ترتیبِ کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عورت پر حیاداری، حفظِ ناموس کی تاکید نماز وزکوۃ کے حکم سے بھی مقدم رکھی گئی ہے'' بہرحال آیت میں براہِ راست ازواج مطہرات کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن یہ ہدایات تمام مسلم خواتین کے لئے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت میں عورتوں کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا گیا، جس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ عورت گھر سے ضرورتاً بھی نہیں نکل سکتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عورت کے لیے بہترین مقام اور سب سے محفوظ جگہ گھر ہے، اس کو ضرورتاً ہی گھر سے نکلنا چاہیے، خود اسی آیت میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، جب یہ کہا گیا کہ زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح بے پردہ ہوکر، لچک لچک کر اپنے محاسن اور زیب وزینت کو دکھاتی نہ پھرنا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو سادگی کے ساتھ، پردے کے اہتمام کے ساتھ محض بقدر ضرورت نکلنا، نہ کہ اس طرح نکلنا کہ اپنے جسم ولباس کے حسن کو نمایاں کر دیا جائے جس سے مردوں کو رغبت ہو، ابوعبیدہ نے ''تبرج'' کی یہی تفسیر کی ہے جو سارے اقوال پر حاوی اور سب کی جامع ہے، اس کے علاوہ ضرورت کے تحت نکلنے کی اجازت اسی سورہ کی آگے آرہی آیت ''یدنین علیھن من جلابیبھن'' سے بھی ظاہر ہے، خود رسول ﷺ کی یہ حدیث صحیح مسلم میں آئی ہے ''قد أذن

لکن أن تخرج لحاجتکن" کہ تمہارے لیے اپنی ضرورت کے تحت گھر سے نکلنے کی اجازت ہے، اس اجازت پر رسول ﷺ اور آپ کی ازواج کا عمل بھی شاہد ہے، البتہ یہ ملحوظ رہے کہ نکلنے کی اجازت ہر حال میں مکمل شرعی پردے سے مشروط ہے، ضرورت کا اطلاق بھی کہاں ہوگا اور کہاں نہیں اور کس حد تک تنہا نکلنا صحیح ہوگا کس حد تک نہیں، یہ الگ تفصیل کا موضوع ہے، یہاں تو بس چھوٹی موٹی ضرورتیں زیر بحث ہیں جن کا ثبوت ازواج مطہرات سے آیت حجاب نازل ہونے کے بعد بھی ملتا ہے کہ وہ اپنے والدین سے ملاقات کے لئے جایا کرتی تھیں، تعزیت و عیادت کے لیے عزیزوں کے یہاں جایا کرتی تھیں۔ غزوات میں بھی ساتھ جانا ثابت ہے۔ بہر حال یہاں تفصیل ہمارا موضوع نہیں اور ایک یہ فقہی بحث ہے، اس کے لیے دیگر کتابوں سے رجوع ہونا چاہیے۔

یہاں اب ذرا اسی سورہ کی اس آیت کو پڑھئے جس کا ذکر اوپر آیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (احزاب ۵۹)

(اے نبی ﷺ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی چادروں اور نقابوں کو اپنے اوپر اس طرح ڈال لیا کریں کہ سر، چہرہ اور سینہ ڈھک جایا کرے، اس میں چہرے کے پردے کی ترجیح ثابت ہوتی ہے، یہ اس کے زیادہ قرین قیاس ہے کہ انہیں اپنے حجاب اور پاکدامنی کے سبب پہچان لیا جائے کہ وہ باحیا و باکردار مسلم خاتون ہے، پھر انہیں کوئی آوارہ و احمق نہ چھیڑے اور نہ تکلیف پہنچائے، جو گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بہت معاف کرنے والا ہے، وہ اپنے بندوں پر بہت رحم کرنے والا ہے، اسی وجہ سے اس نے ان کے لیے احکامِ شریعت تفصیل سے بیان کردیے)

(جلابیب: خمار یعنی اوڑھنی کے اوپر کی بڑی چادر کو کہا جاتا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ سر، سینہ اور چہرہ اور زیب و زینت کے سارے سامان ومظاہر چھپ جائیں، اسکی مزید تفصیل سورہ نور کی آیت میں آئے گی یہ آیت خود ہی بغرضِ ضرورت عورت کے باہر نکلنے کی دلیل ہے، اس میں باہر نکلتے وقت پردے کے آداب بتائے گئے ہیں۔ یہاں ایک بات بڑی قابل غور ہے کہ قرآن مجید نے اس آیت میں مسلم خاتون کی ایک امتیازی شان بیان کی ہے، پردے کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا کہ پردہ کرنے سے وہ پہچان لی جائیں گی اور پھر ان سے کوئی چھیڑ خانی نہیں کرے گا، ظاہر ہے کہ یہ آیت مدینہ کے ماحول میں اتری تھی، جہاں مسلمانوں کی ریاست قائم ہو چکی تھی، عام خواتین کے مقابلہ مسلم باپردہ خواتین سے بولنے اور جملے کسنے یا چھیڑ خانی کرنے کی کسی منافق واوباش کو ہمت نہیں ہو سکتی تھی، لیکن کوئی یہ خطا نہ کر بیٹھے اس لیے امتیازی علامت مقرر کردی کہ اس طرح پردے کے ساتھ نکلیں کہ دور سے ہی پتہ چلے کہ کوئی اللہ کی فرماں بردار بندی، پردہ نشین، باحیا وباکردار، خوددار و پاکباز اور غیرت مند مسلمان خاتون ہے، واقعہ یہ ہے کہ آج کے اس گئے گزرے اور برہنگی کے دور میں بھی پردہ نشین خواتین کو جو احترام ملتا ہے اور ان کی عصمت جس قدر محفوظ رہتی ہے وہ مشاہدے کی بات ہے، اوباش

ولوفر بھی پردہ نشینوں کو دیکھ کر کنارے ہٹتے دیکھے گئے ہیں، جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں شاید ہی کوئی پردہ نشین خواتین کے ساتھ پیش آیا ہو، اس لئے کہ جو آپ اپنی عزت کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی تائید ونصرت کرتا ہے اور پردہ تو ہے ہی عصمت کی حفاظت کا بہترین ذریعہ، ممکن ہے کہ مغرب زدہ بیہودہ لوگ بھپتیاں کسیں اور پردے کا مذاق بنائیں، لیکن پردہ نشین کی طرف آنکھ اٹھائیں اس کی ہمت کم ہی ہوتی ہے، ہاں آج کل کے ماڈرن پردہ کی کوئی قیمت نہیں، اب تو ایسے نقاب وعبایا اور اس پر ناز وادا کا ایسا اضافہ نظر آتا ہے کہ پردے میں رہ کر بھی بے پردگی کے سارے مظاہر نظر آتے ہیں، پردہ ونقاب وہ ہے جس میں سب ناز ونخرے اور مظاہرِ حسن وفتنہ چھپ جائیں، پھر منافق ودل کے روگی کے سوا کسی عام انسان کو رغبت نہ ہو سکے۔

اب پردے کے سلسلے میں سورہ نور کا تفصیلی حکم ملاحظہ کیجئے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (نور. ۳۰)

(اے نبی ﷺ مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ نامحرم عورتوں اور جن چیزوں کو چھپانا لازم ہے ان سے اپنی نظروں کو نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کو حرام میں ملوث ہونے اور اجنبی کے سامنے کھولنے سے حفاظت کیا کریں، وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے واقف ہے اس لیے بندے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے رب کا استحضار رکھے اور اور اس سے ڈرتا رہے)

یہاں اس آیت میں قرآن مجید نے بڑی بلیغ ہدایت دی ہے، دراصل فحش کی طرف لے جانے میں سب سے بنیادی کام نظر ہی انجام دیتی ہے، یہی اولین قاصد کا کام کرتی ہے اور قرآن نے اسی پر روک لگادی، کہ اجنبی مرد کے لئے نامحرم عورت کو نظر بھر کے دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اس حکم میں عورتیں بھی ہیں لیکن ان کا علیحدہ تذکرہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔

اچانک اچٹتی ہوئی نظر پڑ جانا چونکہ آدمی کے بس میں نہیں اس لیے وہ معاف ہے لیکن قصداً نظر بھر کر دیکھنا قطعاً حرام ہے، گویا جہاں بھی اجنبی عورتوں پر نظر پڑنے اور فتنہ میں مبتلا ہونے کے امکانات ہوں اس سے حتی الامکان گریز لازم ہے، اسی طرح شرمگاہوں کی حفاظت کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف کسی بھی حرام طریقہ سے جنسی تلذذ سے حفاظت کرنا بلکہ جنسی ہیجان برپا کرنے والے ان تمام ذرائع اور وسائل سے بھی گریز لازم ہے، جو آج کے ماحول میں بالعموم حرام کاری اور حرام طریقوں سے جنسی تلذذ کا ذریعہ بنتے ہیں، اس سلسلہ میں ٹی وی، انٹرنیٹ، فلموں اور موبائل کا کیا رونا اب تو دیندار یا شریف کہے جانے والے گھرانوں میں بھی لباس کا یہ حال ہوگیا ہے کہ ساری بے لباسی ظاہر وعیاں رہتی ہے، جسم ملبوسات سے ڈھکے ہونے کے باوجود شیطان دعوتِ نظارہ دیتا ہے، زیب وزینت اور فیشن کے شوق نے اب تو نقاب وعبایا کا یہ حال کیا ہے کہ اعضائے جسمانی بے لباسی وبے پردگی کی چغلی کھاتے رہتے ہیں، یہی حال مردوں کے بھی بعض ملبوسات کا ہے جن میں ستر کے نشیب وفراز عیاں رہتے ہیں، یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ شرمگاہوں کی حفاظت کا بڑا ذریعہ لباس ہے بلکہ لباس عزت وعصمت کی

حفاظت کے لیے تمہید ہے۔

اسی سورہ نور میں اس سلسلہ کا اور تفصیلی حکم پڑھیے:

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوٰنِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ص وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ط وَ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ(نور . ۳۱)

(اے نبی ﷺ مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ جن چیزوں پر نظر ڈالنا ان کے لیے حرام کیا گیا ہے ان سے نظریں نیچی رکھا کریں بلکہ نظریں پھیر لیا کریں، اور حرام میں پڑنے سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں، مردوں کے سامنے اپنی زیب و زینت کا مظاہرہ کرتی نہ پھرا کریں، بلکہ چادر، اوڑھنی اور نقاب وغیرہ پہن لیا کریں جس سے عورت کی ظاہری زینت و خوبصورتی و آرائش چھپ جاتی ہے، ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے سروں کی اوڑھنی کو سینے پر بھی ڈال لیا کریں یعنی سینے تک دراز کر لیا کریں، اس میں چہرے کو ڈھکنا بھی شامل ہے، تاکہ مکمل پردہ ہو جائے، اپنی زیب و زینت اور خوبصورتی والے حصوں کو نہ کھولا کریں سوائے اپنے شوہروں کے سامنے، اس لیے کہ شوہر اپنی بیوی کے وہ حصے دیکھ سکتا ہے جو کسی دوسرے کو دیکھنے کی اجازت نہیں، اسی طرح عورت کے بعض اعضائے جسمانی جیسے چہرہ، گردن، ہاتھ، بازو وغیرہ اپنے والد، اپنے خسر، اپنے بیٹے اور اپنے شوہر کے بیٹوں، اپنے بھائیوں اور اپنے بھائی کے لڑکوں اور اپنی بہن کے لڑکوں اور اپنی بہنوں اور مسلمان عورتوں اور اپنی باندیوں اور ان مردوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں جو گھر میں کام کاج اور کھانے پینے کے لیے آیا جایا کرتے ہیں، جنھیں عورت کی شہوت ہی نہیں ہوتی یا ایسے چھوٹے لڑکوں کے سامنے جو ابھی عورت کی پوشیدہ چیزوں سے واقف ہی نہ ہوئے ہوں اور ان کے اندر کوئی شہوت نہ ہو، اور عورت جب چلے تو زور زور سے پاؤں پٹخ کر نہ چلے کہ پازیب وغیرہ نظر آئیں یا ان کی آواز سنائی پڑے، اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کی طرف پلٹو، اس کے احکام کی پابندی کرو اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان سے باز رہو، اچھے اخلاق اور اچھی عادتیں اختیار کرو، زمانۂ جاہلیت کے رذیل کاموں اور فحش و منکرات سے گریز کرو تاکہ تم اللہ کی رضا اور اسکی جنت حاصل کر سکو اور اللہ تمہیں اپنی رحمت سے ڈھانپ لے)

یہ آیت قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہے جس سے بے شمار مسائل اخذ کیے گئے ہیں، عورتوں کی معاشرت، ان کے پردے اور ان کی زیب و زینت سے متعلق رہنما ہدایات اس آیت میں بیان کر دی گئی ہیں، چنانچہ جہاں عورتوں کے لیے غیر محرم مردوں کو دیکھنے سے روکا گیا ہے، وہیں انھیں اس حد تک ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے زیورات تک کی آواز سنانے سے گریز کریں، یہیں سے علماء نے عورت کی آواز پر بھی بحث کی ہے۔ احادیث کی تفصیلات کے مطابق عورت کی آواز کے سلسلہ میں ائمۂ مجتہدین کا اختلاف ہے، بعض آواز کو ستر مانتے ہیں اور بعض کا کہنا کہ جہاں عورت کی آواز سے فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ ہو وہاں ممانعت ہوگی اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو

وہاں ممانعت نہ ہوگی، حدیث سے اتنی بات ثابت ہے کہ پردے کے احکام نازل ہونے کے بعد بھی امہات المومنین ضرورت کے مطابق غیر محرموں سے پردے کے پیچھے سے بات کیا کرتی تھیں، تاہم عورتوں کے لیے یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ غیر محرموں سے ضرورت کے تحت گفتگو کرتے وقت آواز میں لچک اور حد درجہ نسوانیت کا اظہار نہ ہو، یہی معتدل نقطۂ نظر ہے، اس لیے کہ بسا اوقات نظر سے پہلے صرف آواز ہی فتنہ کے آغاز کا سبب بنتی ہے، عہدِ حاضر کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ فون کا ہے، فون پر گفتگو کے آغاز سے زنا اور پھر قتل کے انجام تک پہنچنے کے بے شمار واقعات مشاہدے میں ہیں، اس آیتِ کریمہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کے لیے غیر محرم کے سامنے اپنی کسی چیز، اپنا بناؤ سنگھار، آواز، زیورات اور زیورات کی آواز، خوشبو اور جمالیاتی اشیاء کو ظاہر کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ فتنہ کا دروازہ بند کرنے کے لیے ان تمام راستوں کو بند کرتا ہے جو فتنہ کا سبب بنتے ہیں، بہر حال اس آیت کا تفصیلی مطالعہ دیگر تفاسیر میں کیا جا سکتا ہے، بالخصوص سورۂ نور کی تفسیر مولانا مودودیؒ کی تفسیر میں پڑھی جائے تو عہدِ حاضر کے لحاظ سے وہ زیادہ بہتر ہے، آیت کا ایک ٹکڑا ''ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا'' ہے کہ ''عورتیں اپنی زیب وزینت اور اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں سوائے ان حصوں کے جو کھل ہی جاتے ہیں،'' ''الا ما ظھر منھا'' کی تفسیر میں صحابہ کرام سے لے کر آج تک اختلاف رہا ہے، اسی اختلاف کے سبب چہرے کے پردے میں دو نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس سے اوپر کے کپڑے، چادر اور برقع وغیرہ مراد ہے، اور بعض مفسرین نے اس کا مطلب لیا ہے ''مایظھرہ الا نسان علی العادۃ الجاریۃ'' یعنی جسے انسان عادتاً ظاہر ہی کرتا ہے، اسی بنا پر پھر بعض مفسرین اور فقہائے احناف کی ایک تعداد کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنا جائز ہے البتہ بعد کے علماء نے فتنہ کے خوف سے چہرے کے پردے کو لازم قرار دیا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ حدیث میں چہرہ اور کف ودست کھلا رہنے کی صراحت ملتی ہے، دونوں نقطۂ نظر کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد معتدل بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ عام حالات اور بالخصوص آج کے حالات میں چہرہ کے پردے کو لازم سمجھنا چاہیے کہ وہی اصل موقع زینت، مرکزِ توجہ ورغبت اور باعثِ کشش ہے، اگر ضرورتاً کھولنا پڑے تو چونکہ شرعی نقطۂ نظر سے اجازت ہے اس لیے کھولا تو جا سکتا ہے، لیکن سادگی کے ساتھ نہ کہ میک اپ اور سنگھار کے اظہار کے ساتھ، رہیں آنکھیں اور ہتھیلی وغیرہ تو ان کا بند رکھنا بہر حال باعثِ زحمت ہے اس لیے انھیں کھلا رکھا جا سکتا ہے، آیت کا مجموعی مفہوم اسی کا داعی ہے کہ چہرے جیسے موضعِ زینت کو چھپایا جائے اور ضرورتاً کھولا جائے تو بھی کسی طرح کی آرائش کا اظہار نہ کیا جائے، اس آیت کا مطالعہ کرنے کے بعد ذرا اپنے گھروں، محفلوں اور شادیوں کا جائزہ لے لیجئے کہ ہماری عورتیں ہماری نظروں کے سامنے غیر محرموں کو کس طرح اپنی ادائیں اور اپنی زیب وزینت دکھاتی ہیں، یہاں تو مجبوراً جو حصہ کھلا رہ جاتا ہے اس پر بحث ہے، جبکہ ہماری محفلوں میں مسلمان خواتین کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ نیم برہنہ رہ کر غیر محرموں کے سامنے گھومتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اب تو حس ہی مرگئی ہے، غیرت کا جنازہ ہی نکل چکا ہے، برہنہ کو برہنگی کا احساس ہی نہیں ہوتا، کھلے عام شریعت کی مخالفت پر گناہ کا احساس ہی نہیں ہوتا، یہ اپنے آپ میں بڑی خطرناک اور مہلک بات ہے۔

☆☆☆

❑ گوشۂ عبادت

دعا مانگنا اللہ کی رحمت وقربت نصیب ہونے کا بہترین وسیلہ

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

بلاشبہ دعاء ہر حال میں باعثِ خیر و برکت ہے۔ دعا رجوع الی اللہ ہے، ربِّ کریم سے رحمت، قربت و مغفرت طلب کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ دعاء اور ذکرِ الٰہی میں بہت گہرا تعلق ہے، کوئی بھی دعاء ذکرِ الٰہی سے خالی نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کئے بغیر دعاء ہو ہی نہیں سکتی۔ افضل العبادات نماز پوری کی پوری ذکرِ الٰہی و دعاء سے تعبیر کی جاتی ہے، دعاء کو نماز کی روح اور جان بھی قرار دیا گیا ہے۔ دعا کے لفظی معنیٰ، جیسا کہ معروف ہے، پکارنے اور بلانے کے ہوتے ہیں۔ دعاء مانگنے والا کس کو پکارتا ہے؟، سارے جہاں کے پروردگار اللہ ہی کو پکارتا ہے، وہ کس کو اپنا دکھڑا سناتا ہے؟ ربِّ کریم کو، اور دعاؤں میں کس سے اپنی مرادیں مانگتا ہے؟ آسمانوں و زمین کے خزانوں کے مالک اللہ ربّ العالمین سے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مصائب و مشکلات سے نجات کے لئے دعاء کرنے والا اللہ کی صفتِ رحیمیت و رحمانیت کو یاد کرتا ہے، تنگ دستی یا معاشی مسائل کے حل کے لئے دعاء کرتے ہوئے اللہ کی صفتِ ربوبیت و رزّاقیت کا سہارا لیا جاتا ہے، خطاؤں کو درگزر کرنے کی دعاء مانگتے یا مغفرت طلب کرتے وقت گنہ گار بندہ اللہ کی صفاتِ ''غفور، غفّار، توّاب'' (مغفرت فرمانے والا، خوب بخشنے والا، بہت توبہ قبول فرمانے والا) کا حوالہ دیتا ہے، یعنی اللہ رب العزت کی اُن صفات کو یاد کرتا ہے جن سے اس کی رحمت و مغفرت نوازی اور توبہ کی قبولیت واضح ہوتی ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جو شخص بھی کسی مقصد سے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنی زبان میں بار باران ندائیہ الفاظ (یا اللہ، یارب، یارحمٰن، یارحیم، یا کریم) کو دہراتا رہتا ہے۔ زبان سے دعائیہ کلمات ادا کرنا یا اپنی مشکلات، پریشانیوں اور مسائل سے نجات کے لئے اللہ سے فریاد کرنا درحقیقت ربِّ کریم سے رجوع کرنا اور اللہ جلّ شانہٗ کے ذکر سے اپنی زبان کو تر کر لینا اور اپنے قلب و دماغ کو اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے احساس سے معمور کر لینا ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ذکرِ الٰہی اور دعاء کے فضائل و برکات میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، مثلاً اللہ کی قربت و رحمت نصیب ہونا، نیک عمل کی توفیق ملنا، گناہ سے محفوظ رہنا، ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کا میسر آنا اور نصرتِ الٰہی سے شادکام ہونا۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ذکرِ الٰہی سے شغف رکھنے والا اپنے آپ کو اللہ رب العزت سے بہت قریب محسوس کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ:۱۵۲/۲) [اے بندو!] تم مجھے یاد کروگے، میں تمھیں یاد کروں گا)۔ ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت کا کسی بندے کو یاد کرنا اپنی رحمت و عنایت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت سے دعائیں مانگنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بلا کسی واسطہ اپنے رب سے انتہائی قریب ہو کر اس سے راز و نیاز کی باتیں

کررہا ہے، اسے اپنی فریاد سنا رہا ہے اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے اس سے رحم وکرم کی التجاء کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ دعائیں مانگنے والے بندے سے کتنا قریب ہوتا ہے، یہ تو اس نے اپنی کتابِ ہدایت میں اپنے رسول محبوب ﷺ سے واضح فرمادیا: وَ اذا سَـأ لَکَ عِبَـادِیْ عَـنِّـیْ فَـاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْـبُ دَعْـوَۃَ الـدَّاعِ اِذا دَعَـان فَـلْیَسْتَجِیْبُوْا لِـی وَلْیُـؤْمِـنُـوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْ شُدُوْنَ (البقرۃ:۱۸۶/۲)[اور [اے محمد ﷺ] جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں [تو انہیں بتا دیں کہ] میں ان سے بہت ہی قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے، یعنی مجھ سے دعاء مانگتا ہے]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: وَ قَـالَ رَ بُّکُمُ ادْعُو نِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن:۶۰/۴۰)[اور تمھارے رب نے یہ فرمادیا ہے: مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا]۔ بقول مولانا مجیب اللہ ندویؒ :قرآنی اور مسنونہ دعاؤں کے ''الفاظ کے ذریعہ جب آپ اپنی کوئی التجا پیش کریں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کے اور خدا کے درمیان جتنے پردے تھے وہ ہٹ گئے ہیں، واسطوں کی تمام زنجیروں کو توڑ کر آپ براہ راست بارگاہ قدوسی میں پہنچ کر اپنی یادداشت پیش کررہے ہیں'' (ذکر و دعاء، مکتبہ ندوۃ التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ ۲۰۰۲ء، ص۱۰)۔

یہ امرِ بدیہی ہے کہ جس طرح اللہ کو یاد کرنا انسانی فطرت ہے، اسی طرح اس سے دعاء مانگنا اور اسے اپنی فریاد سنانا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ بلاشبہ مالک الملک و پروردگارِ عالم سے دعاء مانگنا بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ یہ ربِّ کریم کا کتنا بڑا فضل وکرم ہے کہ ذکر و دعاء سے انسان اپنی ضرورت پوری کررہا ہے اور وہ دعائیں مانگنے والوں کو اپنی قربت وعنایت سے نواز رہا ہے۔ اللہ کی کرم فرمائی کی انتہاء نہیں، وہ اپنے بندوں سے پہلے یہ سوال کرتا ہے کہ بتاؤ کون ہے جو بے کس ولاچار کی دعائیں سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور کون ہے جو پریشاں حال کی تکلیف دور کرتا ہے؟ اور پھر ان سے مخاطب ہوکر پوچھتا ہے: کیا اس میں اس کا کوئی شریک ہے؟۔ یعنی ہرگز نہیں، بے شک یہ اللہ ہی ہے جو ان کی تکلیف کو دور کرتا ہے، اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے یہ آیتِ کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

أَمَّـنْ یُّـجِیْـبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ قَلِیْلاً مَّا تَذَکَّرُوْنَ (النمل:۶۲/۲۷)

(کون ہے؟ [ذرا سوچو] جو پریشاں حال و بے قرار کی سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور [کون ہے؟] جو مصیبت دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں اختیار دیتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے [سوچ کر بتاؤ]، تم لوگ بہت کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو)

سوال وجواب کے اس اسلوب سے دراصل انسان کے ذہن میں یہ حقیقت جاگزیں کرنی مقصود ہے کہ اللہ رب العزت کے سوا کوئی نہیں جو انہیں آفت ومصیبت سے نجات دے اور ان کی مشکلات دور فرمائے۔ اس آیت سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے: وَمَـا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (آل عمران:۱۲۶/۳)[مدد نہیں آتی ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے جو غالب ہے، حکمت والا ہے]۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہر حال میں اللہ رب العالمین سے ہی رجوع کریں، اسی سے دعائیں مانگیں۔ اللہ رب العالمین کے فضل وکرم کی کوئی حد و انتہاء نہیں، نہ ہی اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے، اس لئے چاہئے کہ لوگ اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔ اپنے بندوں پر رحم وکرم کی یہ بھی شانِ ربِّ کریم ہے کہ وہ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور ان سے ناراض ہوتا ہے جو اس سے نہیں مانگتے، وہ کتنا بڑا داتا ہے کہ مانگنے پر خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے پر ناخوش۔

دعاء کے فضائل و برکات کے ضمن میں یہ نکتہ بڑی توجہ کا طالب ہے کہ اللہ سے دعاء مانگنا اس قدر موجب خیر و رحمت ہے کہ دعا مانگنے کی توفیق مل جانے پر ہی اس کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور بتوفیقِ الٰہی اسے شرفِ قبولیت نصیب ہو جائے تو رحمتِ الٰہی کے کتنے خزانے دعاء مانگنے والے کی جھولی میں آئیں گے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من فتح له منكم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة** (جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب من فتح له منكم ابواب الرحمة) [جس شخص کے لئے دعاء کا دروازہ کھول دیا گیا اس کے لئے گویا رحمت کے دروازے کھول دئے گئے]۔اسی حدیث میں آگے مذکور کلمات ہی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دعاء کی توفیق ملنے ہی پر رحمت کے کتنے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں: **وما سئل الله شيئاً يعني احب الى الله من ان يسئل العافية و قال رسول الله ﷺ انّ الدعاء ينفع ممّا نزل و ممّا لم ينزل فعليكم يا عباد الله بالدعاء** [اللہ سے جو چیزیں مانگی جاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ عافیت ہے۔دعاء نفع بخش ہے اس (آفت) کے لئے جو نازل ہو چکی ہے اور (نافع ہے) اس (آفت سے حفاظت) کے لئے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی ہے۔پس اے اللہ کے بندو! دعاء کا اہتمام اپنے اوپر لازم کرلو]۔اِس حدیث کے حوالے سے مولانا محمد فاروق خاں کے یہ تشریحی الفاظ بڑی اہمیت اور معنویت رکھتے ہیں: ''دعاء اپنی حقیقت کے لحاظ سے انسان کے دل کی تڑپ اور اس کی روح کی طلب کا دوسرا نام ہے۔جب کسی بندہ کو سچی طلب اور تڑپ میسر آ گئی تو اس کے لئے رحمت کے دروازے بند نہیں رہ سکتے'' (کلامِ نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ۱/۴۹۹، حاشیہ نمبر۔۵)۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا ہر حال میں موجبِ برکت و رحمت ہے، یعنی اللہ سے دعاء مانگنے والا کبھی نامراد نہیں ہوتا، کسی نہ کسی صورت میں اس کا فیض اسے ضرور پہنچتا ہے۔حضرت زکریا علیہ السلام کی زبان سے نکلے ہوئے یہ کلمات اسی حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں: وَلَمْ أَكُنْ بِدعائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم:۱۹/۴) [اے میرے رب میں تجھ سے دعاء مانگ کر کبھی نامراد نہیں ہوا]۔دعاء مانگنے پر کیا فیوض و برکات نصیب ہوتے ہیں یا ہوں گے، اس کی ایک عمدہ وضاحت اس حدیث سے ملتی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ربِّ کریم سے دعاء مانگنے پر کچھ نہ کچھ ضرور عطا ہوتا ہے، بشرطیکہ دعاء میں کوئی گناہ یا قطعِ رحمی کی بات نہ ہو۔حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مسلم دعاء مانگتا ہے اور اس میں گناہ یا قطعِ رحمی کی کوئی بات نہیں ہوتی تو تین صورتوں میں اس کو قبولیت عطا ہوتی ہے: اول یہ کہ بندہ نے جو چیز مانگی ہے وہی اسے عطا کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ثواب آخرت کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ دعاء کے صلہ میں آئندہ آنے والی کوئی مصیبت ٹال دی جائے۔یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے کہا کہ تب تو ہم خوب دعاء مانگیں گے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ [جتنا چاہو مانگو] اللہ کے پاس اس سے بھی زیادہ ہے (مسند احمد ابن حنبل، بیت الافکار الدولیۃ، الاردن، ص۷۶۲)۔اس حدیث کی تشریح میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ''کنز العمّال'' کے حوالے سے ایک دوسری حدیث نقل کی ہے، یہاں اس کا مفہوم بیان کرنا اہمیت سے خالی نہ ہوگا: روزِ جزا جب اللہ تعالیٰ بندوں کی اُن دعاؤں کے جمع شدہ اجر و ثواب عطا فرمائے گا جو [بعینہ دنیا میں] قبول نہیں ہوئی تھیں تو وہ کہیں گے: **يَا لَيْتَه لَمْ يُعَجَّلْ لَه شَئٌ مِنْ دُعَائِه** [کاش! میری کوئی بھی دعاء دنیا میں قبول نہ ہوئی ہوتی، یعنی ہر دعا کا پھل مجھے یہیں ملتا۔ (معارف الحدیث،، الفرقان بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۹۹ء، ۵/۱۴۲-۱۴۳)۔

مختصر یہ کہ دعاء مانگنا درحقیقت اللہ کو یاد کرنا، اس سے رجوع کرنا اور ربِّ کریم سے رحمت ومغفرت اور مصائب و مشکلات سے نجات طلب کرنے کی التجاء کرنا ہے۔ اللہ بڑا رحیم وکریم ہے، اس کے فضل وکرم کی انتہاء نہیں، کسی نے سچ کہا ہے: ''درِ کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا''۔ لہٰذا بندے کو جو کچھ مانگنا ہو، اللہ ربّ العالمین ہی سے مانگے، کوئی پریشانی وتکلیف ہو، یا کوئی معاملہ درپیش ہو تو اسی سے رجوع کرے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ دعاء مانگنے یا اللہ سے اپنی مرادیں طلب کرنے کے لئے قرآن وسنت کے اصول وآداب اختیار کرے اور وہ اپنے اوپر عاجزی وفروتنی، مَسکنت و لجاجت، احتیاج و انابت الی اللہ کی کیفیت طاری کرلے۔ اس ضمن میں اس جانب توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رزقِ حلال اور دعاء کی قبولیت میں بہت گہرا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات (البقرۃ:۲/۱۶۸،۱۷۲؛ المائدۃ:۵/۸۸؛ الانعام:۶/۱۴۲؛ الاعراف:۷/۸۵؛ النحل:۱۶/۱۱۴؛ المطفّفین:۸۳/۱-۳) پر اہلِ ایمان کو عمومی طور پر پاک وحلال روزی کھانے کی تاکید کے علاوہ ایک مقام پر خاص طور سے انبیاء کرام کو خطاب کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (المؤمنون:۲۳/۵۱) [اے رسولو! پاک چیزیں کھاؤ اور عملِ صالح کرو، بے شک میں اس سے باخبر ہوں جو کچھ تم لوگ کرتے رہتے ہو]۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد شفیعؒ تحریر فرماتے ہیں:

''علماء نے فرمایا کہ ان دونوں حکموں (اکل طیب وعمل صالح) کو ایک ساتھ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حلال غذا کا عمل صالح میں بڑا دخل ہے، جب غذا حلال ہوتی ہے تو نیک اعمال کی توفیق خود بخود ہونے لگتی ہے اور غذا حرام ہو تو نیک کام کا ارادہ کرنے کے باوجود بھی اس میں مشکلات حائل ہو جاتی ہیں'' (معارف القرآن، مکتبۂ مصطفائی، دیوبند، بدون تاریخ، ۶/۳۱۶)۔

آخر میں خلاصۂ بحث کے طور پر مفسرِ گرامی تحریر فرماتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور دعاء کے قبول ہونے میں حلال کھانے کو بڑا دخل ہے، جب غذا حلال نہ ہو تو عبادت اور دعاء کی مقبولیت کا بھی استحقاق نہیں رہتا'' (حوالۂ مذکور، ۶/۳۱۶)۔ اسی سلسلہ میں یہ ذکر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ روزانہ صبح کو جن دعاؤں کا مانگنا نبی کریم ﷺ کا معمول رہا ہے ان میں یہ معروف دعاء بھی شامل تھی: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْماً نَافِعاً وَّ رِزْقاً طَیِّباً وَّ عَمَلاً مُّتَقَبَّلاً (سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ، باب مایقال بعد التسلیم) [اے اللہ میں تجھ سے نفع بخش علم، پاک روزی اور (تیری بارگاہ میں) مقبول (ہونے والے) عمل کا سوال کرتا ہوں]۔ اس دعاء کے الفاظ سے پاک روزی اور عمل مقبول میں تعلق مزید واضح ہوتا ہے۔

ربِّ کریم سے دعاء مانگنے کے اصول وآداب اور فیوض وثمرات کیا ہیں؟ یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس باب میں قرآن وحدیث سے اخذ کردہ نکات کو مختصراً ذیل میں واضح کیا جارہا ہے:

☆ قرآن کریم کے مطابق ذکرِ الٰہی ودعاء اللہ کی رحمت وقربت نصیب ہونے کا ذریعہ ہے، اور حدیث میں دعاء کو مومن کا ہتھیار، دین کا ستون اور آسمانوں وزمین کا نور کہا گیا ہے۔

☆ اللہ رب العزت کی حمد وثنا اور رسول اکرم ﷺ پر درود وسلام کے بعد دعاء مانگی جائے۔

☆ عاجزی وانکساری اور رونے گڑگڑانے کی کیفیت

اللہ کو بہت پسند ہے، اسی کیفیت کے ساتھ دعاء مانگی جائے۔

☆ اللہ رب العزت کی عظمت کے احساس اور اس کی گرفت کے خوف کے ساتھ، عاجزی وزاری کی کیفیت سے دل معمور ہو۔

☆ ربِّ رحیم وکریم سے مغفرت طلب کرتے وقت اپنے گناہوں کا بار بار اقرار کیا جائے۔

☆ اہم ومخصوص دعائیں بار بار، کم از کم تین بار مانگی جائیں۔

☆ دعاء مانگ کر بے صبری کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔

☆ اپنی دعاؤں میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے اور ابتداء اپنی ذات سے کی جائے۔

☆ آخرِ شب میں ربِّ کریم کی جانب سے یہ خصوصی ندا ہوتی ہے: ہے کوئی دعاء مانگنے والا کہ میں اس کی دعاء قبول کروں؟، اس ندائے غیبی پر عملاً لبیک کہنے والے بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں۔

☆ اللہ رب العزت بندوں سے پوچھتا ہے: بتاؤ کون ہے جو پریشاں حال و بے قرار کی فریاد سنتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے؟ بلا شبہ ہر مومن کے دل کی صدا یہی ہوتی ہے کہ: اے اللہ! بے شک تو ہی ہے جو پریشاں حال کی فریاد سنتا ہے اور اس کی بے قراری دور فرماتا ہے۔

☆ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم کی انتہا نہیں، وہ دعاء مانگنے پر خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے پر ناراض ہوتا ہے۔

☆ دعاء مانگنے والا کبھی محروم نہیں رہتا، کسی نہ کسی صورت میں اسے دعاء کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

☆ دعاء کی توفیق ملنے سے ہی رحمتِ الٰہی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

☆ دعاء نافع ہے اس بلاء سے نجات کے لئے جو نازل ہو چکی ہے۔

☆ دعاء نفع بخش ہے اس بلاء سے حفاظت کے لئے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی ہے۔

☆ آرام وسکون کی حالت میں دعاء مانگتے رہنے پر مشکلات ومصائب کی حالت میں مانگی جانے والی دعاء قبول ہوتی ہے۔

دعاء مانگنے کے مذکورہ بالا فیوض وبرکات سامنے آنے یا ان کا احساس ہونے پر یہ طلب پیدا ہوئی کہ اللہ کی رحمت و مغفرت سے مشرف ہونے اور مسائل کے حل ومشکلات کے ازالہ کے لئے خود دعاء کا سہارا لینے کے ساتھ دوسروں کو اس کی ترغیب دی جائے۔

حقیقت یہ کہ کسی بھی اچھی بات یا خیر کے کسی کام کی طرف متوجہ کرنے یا اس کی یاد دہانی کرنے والا اسے خود یاد رکھتے ہوئے اپنے لئے نفع بخش بنائے گا تو دوسروں کو اس کی تذکیر یا یاد دہانی کی تاثیر اور نافعیت میں مزید اضافہ ہوگا۔ اللہ کرے اس راقم عاجز کو خیر پر عمل کی توفیق نصیب ہو۔ آمین۔ اللہ رب العزت اس تذکیری تحریر کو قارئین کے لئے موجبِ خیر وبرکت بنائے، اس کے نکات کو خاص طور سے رجوع الی اللہ وانابت الی اللہ کی کیفیت پیدا کرنے و پروان چڑھانے کے لئے افادیت بخشے اور راقمِ عاجز کے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ کا ذریعہ بنائے۔ اللہ کرے ہمیں خیر کی باتیں یاد رکھنے، ان پر خود عمل کرنے اور دوسروں کو یاد دلانے کی توفیق نصیب ہو۔

اللّٰھمَّ وفقنی لما تحبُّ و ترضیٰ ۔ ربّناعلیك توكّلنا و الیك انبنا الیك المصیر ۔ربِّ اِغفر وارحم وانتَ خیر الرٰحمین۔ آمین ثمّ آمین۔

☆☆☆

❑ تحقیق و تنقید

(قسط-۳)

اہل کتاب کے کفر کے اسباب

مولانا محمد غزالی ندویؒ

۸۔انبیا علیہم السلام کی شان میں گستاخی

قدیم یہود ونصاری نے انبیا علیہم السلام پر بہت ہی گھناؤنے الزامات اور عیب لگائے ہیں، اور چونکہ ان الزامات کو انھوں نے اپنی مقدس کتابوں میں جگہ دے دی، اس لیے موجودہ یہود ونصاری بھی ان پر یقین رکھتے ہیں اور انبیا علیہم السلام کو بری چیزوں سے متصف کرتے ہیں۔

اسلام کے مطابق انبیا گناہوں سے معصوم اور پاک ہوتے ہیں۔(۱۷)

بقول علامہ سید سلیمان ندوی: ''نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہوسکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لیے اسلام نے اس عقیدے کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ایک ایک کرکے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے اُن کے احوال میں شامل کردیا ہے۔انبیا علیہم السلام کے لیے بار بار قرآن نے ''چن کر پسند کرنے کا لفظ'' استعمال کیا ہے، جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے۔عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ﴾[الحج: ۷۵].

''خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبروں چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں میں سے''۔

ایک آیت میں پیغمبروں کے لیے ''اصطفا'' کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے: ﴿إِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ﴾ [ص: ۴۵-۴۷].

''ہمارے خاص بندوں: ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوتِ عمل) والے اور آنکھوں (قوتِ علم) والے تھے۔ ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لیے خالص کیا۔اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے''۔

سورۂ انبیا میں اکثر پیغمبروں کے تذکرے کے بعد فرمایا:

﴿وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِيْنَ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِيْنَ﴾ [الأنبياء:۷۲-۷۳].

''ان میں سے ہر ایک ہم نے صالح بنایا اور ہم ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے۔اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے''۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہوسکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [الأنعام : ٨٦]. ''یہ سب صالحوں میں سے تھے''۔

پھر آگے چل کر فرمایا: ﴿وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾[الأنعام : ٨٧۔ ''ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت دی''۔

پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [الأنعام : ٨٧].

''اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا، اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا''۔

صلاح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔ (۱۸)

اسلام میں انبیا کا مقام اتنا بلند ہے کہ اُن پر الزامات اور عیب لگانا، ان کی شان میں گستاخی کرنا، انھیں گالی دینا، یا ان کے نسب پر شبہات قائم کرنا سخت گناہ کی بات اور کفر ہے، اور اس پر دردناک سزا کی وعید ہے۔ اس سلسلے میں قرآن وحدیث میں بے شمار دلائل ہیں۔ ہم ان میں سے صرف چند بیان کرتے ہیں۔

(۱) سورۂ براءت میں ہے: ﴿وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ﴾[التوبة: ٦١] .

''اور انھی میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ وہ تو بس کان ہی کان ہیں''۔

پھر ان کی سزا یہ بتائی کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ [التوبه: ٦١].

''اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اب غور کر لیا جائے کہ اُذن کہنے پر جب یہ ساری باتیں اور وعیدیں سنائی گئی ہیں، تو اہل کتاب کا کیا حشر ہوگا جنھوں نے انبیا علیہم السلام پر گھناؤنے الزامات لگائے۔

(۲) انبیا علیہم السلام کی کس قدر عظمت مومنین کے دلوں میں ہونی چاہیے، اس کا اندازہ اس آیت سے کیا جا سکتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْ م بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب:٥٣].

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں مت جایا کرو، مگر جس وقت تم کو کھانے کے لیے اجازت دی جائے ایسے طور پر کہ اس کی تیاری کے منتظر نہ رہو؛ لیکن جب تم کو بلایا جائے تب جایا کرو۔ پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھا کرو، اس سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالی صاف بات کہنے سے لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم ان (ازواج مطہرات) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگا کرو۔ یہ بات تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ اور تم کو جائز نہیں کہ رسول اللہ کو کلفت پہونچاؤ اور نہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیبیوں سے کبھی نکاح کرو۔ یہ خدا کے نزدیک بڑی بھاری بات ہے''۔

اس آیت میں مومنین کو ہدایت دی گئی ہے کہ نبی کے گھروں میں یوں ہی نہ جایا کرو، الّا یہ کہ کھانے پر بلایا جائے۔ اور اگر کھانے پر بھی بلایا جائے تو برتنوں پر خواہ مخواہ نظر نہ ڈالی جائے اور کھانے کے فوراً بعد وہاں سے نکل جایا جائے اور گپیں نہ لڑائی جائیں؛ اس لیے کہ یہ چیز نبی کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اور نبی کی ازواج سے پردے کے پیچھے سے سامان مانگا جائے۔ پھر دوبارہ تاکیداً کہا گیا:

﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾

''تمھارے لیے اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچانا جائز نہیں ہے''۔

(۳) ایک اور موقع پر اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّلَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ [الأحزاب ٥٧].

''بے شک جو لوگ اللہ تعالی اور اس کے رسول (ﷺ) کو ایذا دیتے ہیں، اللہ تعالی ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

اس آیت میں نبی کو ایذا پہنچانے والے کے لیے دو سزائیں بتائی گئی ہیں:

۱۔ دنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت، یعنی اللہ کی رحمت سے دوری۔

۲۔ ''عـذابٌ مهيـنٌ''، یعنی ذلت آمیز عذاب۔ امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ ''عـذابٌ مهيـنٌ'' کا لفظ قرآن کریم میں صرف کفار کے لیے استعمال ہوا ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نبی کو ایذا پہنچانے کی اس سے بری شکل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس پر گھناؤنے قسم کے الزامات لگائے جائیں؟

(۴) سورۂ حجرات کی ابتدائی چار آیات میں ایمان والوں کو نبی کے ساتھ رہنے کے آداب سکھائے گئے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ سکھائی گئی ہے کہ نبی کے آگے آگے بات نہ کی جائے۔ دوسری بات یہ کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کی جائے۔ تیسری بات یہ کہ جس طرح تم ایک دوسرے کو زور سے پکارتے ہو اس طرح نبی کو زور سے مت پکارا کرو، مبادا تمھارے سارے اعمال بے کار ہو جائیں اور تمھیں احساس بھی نہ ہو۔ پھر اچھے لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ جو نبی کے پاس اپنی آواز پست رکھتے ہیں، ان کے دل اللہ نے تقوی کے لیے پرکھ لیے ہیں اور ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

اس آیت میں یہ حکم خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ نبی کو اس طرح زور سے نہ پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو؛ ورنہ خطرہ ہے کہ تمھارے سارے اعمال بے کار نہ ہو جائیں، جو صرف کفر کی صورت میں ہوتا ہے۔ (۱۹) تو جب زور سے نبی کو پکارنے پر اعمال اکارت اور بے کار ہونے کا خطرہ ہے؛ حالانکہ اس میں بے ادبی کا قصد کم ہی ہوتا ہے، تو پھر انبیا علیہم السلام پر جان بوجھ کر شادی شدہ عورت سے اور بیٹی سے زنا کا (نعوذ باللہ) الزام لگانے کا کیا انجام ہوگا؟۔

(۵) قرآن میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ نبی ﷺ کو مخاطب کرنے کے لیے ''رَاعِنَا'' کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے ''أُنْظُرْنَا'' کا لفظ استعمال کریں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [البقرة ١٠٤].

''اے ایمان والو! تم ''راعنا'' نہ کہا کرو۔ ''انظرنا'' کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

أنظرنا کے جو معنی ہیں ''راعنا'' کے بھی تقریبا وہی معنی ہیں؛ لیکن یہودی اس کو بدل کر ''راعينا'' کر دیتے تھے جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں، اور ظاہر یہ کرتے تھے، جیسے انھوں نے ''راعنا'' کہا ہو۔ ''راعنا'' اور ''راعينا'' میں چونکہ تلفظ کے اعتبار سے بہت باریک سا فرق ہے، اس لیے ان کے لیے شرارت کرنا آسان تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت کر دی کہ وہ یہ لفظ ہی استعمال نہ کریں، اور اس حکم کے فوراً بعد یہ کہا: ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ اس طرح گستاخی کرنا کافروں کا کام ہے، جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

انبیا پر عیب لگانا بالاجماع کفر ہے

مذکورہ آیات اور بعض حدیثوں کی بنا پر علمائے اسلام کا متفقہ طور پر یہ ماننا ہے کہ انبیا علیہم السلام پر عیب لگانا، انھیں قتل کرنا، یا ان کی شان میں گستاخی کرنا کفر ہے، اور ایسا کرنے والا کافر ہے۔

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں: " أجمع المسلمون على أن من سبّ الله، أو سبّ رسوله ﷺ، أو د

فع شيئاً مما أنزل الله عز وجلّ،

''مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول ﷺ کو گالی دے یا اللہ کے نازل کردہ کسی حکم کو رد کرے، یا کسی نبی کو قتل کرے،

أو قتل نبياً من أنبياء الله عز وجل أنه كا فر بذلك وإن كان مقرّا بكل ما أنزل الله". (۲۰)

تو وہ اس عمل کی بنا پر کافر ہو جائے گا، چاہے وہ اللہ کی نازل کردہ تمام چیزوں کو مانتا ہو''۔

قاضی عیاض نے لکھا ہے:

"من استخف به ﷺ، أو بأحد من الأنبياء، أو أزرى عليهم، أو آذاهم، أو قتل نبياً، أو حاربه، فهوكافر بإجماع". (۲۱)

''جس نے محمد ﷺ یا انبیا میں سے کسی کی توہین کی، یا ان پر عیب لگایا، یا انھیں تکلیف پہنچائی، یا کسی نبی کو قتل کیا، یا اس سے جنگ کی، تو وہ کافر ہے''۔

الفتاوی الہندیہ میں ہے:

"ومن لم يقر ببعض الأنبياء أو عاب نبياً بشيءٍ أو لم يرض بسنة من سنن المرسلين عليهم الصلاة والسلام كفر". (۲۲)

''جو کسی نبی کا انکار کرے یا اُس پر کسی طرح کا عیب لگائے، یا رسولوں کے کسی طریقے کو ناپسند کرے وہ کافر ہے''۔

علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں:

"ومن ذلك أيضاً تكذيب نبي أو نسبة تعمد كذب إليه أو محاربته أو سبّه أو الاستخفاف به.....لأن تكذيبه ولو في الأمر الدنيوي صريح في عدم عصمته عن الكذب وفي إلحاق النقص به، و كلاهما كفر". (۲۳)

''کفر میں سے یہ بھی ہے کہ کسی نبی کو جھٹلایا جائے، یا اس کی طرف جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کی نسبت کی جائے، یا اس سے جنگ کی جائے، یا اسے گالی دی جائے، یا اس کی توہین کی جائے.....اس لیے کہ نبی کو جھوٹا قرار دینا (خواہ دنیوی معاملے میں ہی کیوں نہ ہو) اس بات کی واضح علامت ہے کہ اسے جھوٹ سے محفوظ تصور نہیں کیا جا رہا ہے اور اسے عیب دار قرار دیا جا رہا ہے، اور یہ دونوں باتیں کفر ہیں''۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل کتاب کے عقیدے کے مطابق انبیا علیہم السلام گناہوں سے معصوم نہیں ہوتے، اس لیے اگر اہل کتاب اپنے انبیا علیہم السلام پر کوئی الزام لگاتے ہیں، تو چونکہ ان کے اصولوں کے مطابق اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے، اس لیے انھیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن سوچنے کا یہ انداز صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ اگر اس منطق کو درست مان لیا جائے تو پھر دنیا کی کسی چیز کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ جو مشرکین بتوں کی پوجا کرتے ہیں خود اپنے اصولوں کے مطابق وہ درست ہوتے ہیں؛ بلکہ موحد ہوتے ہیں، چنانچہ مشرکین مکہ کہتے تھے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر:۳]. ''ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں''۔

اسی طرح اس منطق سے تثلیث کے قائلین کو بھی کافر نہیں کہا جا سکتا؛ کیوں کہ وہ تثلیث کو توحید کے خلاف نہیں مانتے ہیں، جب کہ قرآن وضاحت سے کہتا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ [المآئدة:۷۳]. ''ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنھوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے''۔

انبیا علیہم السلام کو بری باتوں سے دور رکھنے میں اللہ کی حکمتیں

پہلی حکمت: لوگوں میں شریعت سے بے اعتمادی پیدا نہ ہو

اللہ تعالی نے تمام انبیا علیہم السلام کو بری باتوں سے دور رکھا ہے، اس میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ایک بہت بڑی حکمت یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے ذریعے ہی اللہ تعالی اپنے بندوں کو نیک کام کرنے اور بری باتوں سے بچنے کا

حکم دیتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے ذریعے ہی انسانوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور کس چیز سے ناراض۔ کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری۔ اب اگر انبیا علیہم السلام خود ہی گناہ کرنے لگیں تو لوگوں کا ان پر اعتماد ختم ہو جائے گا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں کا وزن باقی نہیں رہے گا۔ مثلاً اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو سگریٹ پینے سے منع کرے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے، پھر اس کے سامنے خود پیے تو اس کی بات کی اہمیت ختم ہو جائے گی؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جب چنا، تو ان کو ہر قسم کی بری باتوں سے محفوظ فرما دیا؛ تاکہ لوگ اللہ کے پیغام کے تعلق سے کبھی بداعتمادی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت: انبیا نمونہ ہوتے ہیں

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بہت خوب لکھا ہے:

''کیا کسی گنہ گار اور عصیان کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ تاریکی سے روشنی کبھی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گنہ گاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟''۔ (۲۴) ہرگز نہیں!

انبیا علیہم السلام کو گناہوں اور بری باتوں سے دور رکھنے میں سب سے بڑی حکمت یہی ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی قوم کے پیشوا اور اُس کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اُن کی اطاعت قوم پر واجب ہوتی ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ [النساء: ٦٤].

''ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا؛ لیکن اس لیے کہ خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے''۔

وہ سب اپنی قوم سے اپنی اتباع کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سورہ شعراء میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب (علیہم السلام) سب کے تعلق سے الگ الگ آیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کیا تھا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ﴾ [الشعراء: ۱۰۸-۱۸۹] ''تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو''۔

اب اگر نبی خود برے کام کر رہا ہو، تو وہ اپنی برائیوں میں اپنی قوم کے لیے نمونہ بن جائے گا۔ اور جس قوم کے نمونے کے افراد ہی برائیوں میں ڈوبے ہوئے ہوں، اندازہ لگائیے کہ ایسی قوم برائی میں کس حد تک پہنچ جائے گی! ایک بچے کے لیے نمونہ اس کے ماں باپ ہیں، اگر ایک بچے کا باپ شرابی ہو، یا کسی بچی کی ماں اگر بدچلن ہو، تو اس بچے اور بچی میں بھی اس خصلت کے پیدا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے۔ جس طرح ماں باپ بچوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں، اسی طرح قومی سطح پر انبیا علیہم السلام بھی اپنی قوموں کے لیے نمونہ ہوا کرتے ہیں، وہ اگر خراب ہوں گے یا برے کاموں میں ملوث ہوں گے، تو پوری قوم خراب ہو سکتی ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ انبیا علیہم السلام کو تمام بری باتوں سے محفوظ فرماتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کو گناہوں سے محفوظ رکھنے کا خدائی انتظام

انبیا علیہم السلام کو گناہوں سے محفوظ رکھنے کا خاص خدائی انتظام کیا جاتا ہے۔ ایک تو ان کا دل ہی ایسا پاک صاف بنایا جاتا ہے کہ گناہوں کے تقاضے انھیں راہ راست سے ہٹا نہیں پاتے۔ ثانیاً انھیں جزا و سزا کا علم الیقین حاصل ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعے ان کا آسمان سے جو رابطہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے گویا جنت و جہنم ان کے سامنے ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ اللہ کے تمام بندوں میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"إن أتقاكم وأعلمَكم باللّٰه أنا". (۲۵)

''تم سب میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اُس کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے والا میں ہوں''۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

"والذی نفس محمد بیده، لو تعلمون ما أعلم لبکیتم کثیراً ولضحکتم قلیلاً". (۲۶)

''خدا کی قسم! اگر تمھیں وہ باتیں معلوم ہو جائیں جو میں جانتا ہوں، تو تم خوب رویا کروگے اور تمھارا ہنسنا کم ہو جائے گا''۔

انبیا علیہم السلام پر الزامات لگانے والے کافر کیوں؟

جہاں انبیا علیہم السلام کو گناہوں سے محفوظ کیا جاتا ہے، وہیں وہ لوگ جو ان کی شخصیت کو داغ دار کریں، ان پر عیب لگائیں، ان کو گناہوں سے متصف کریں وہ خدا کے نزدیک کافر قرار پاتے ہیں۔ وہ قانون توڑنے کے مجرم نہیں؛ بلکہ قانون پر اعتماد کو مجروح کرنے کے مجرم ہوتے ہیں، اور یہ چیز بغاوت کے زمرے میں آتی ہے۔ اگر کسی عظیم شخصیت کو قتل کر دیا جائے تو اس سے اس کے کام کو عموماً وہ نقصان نہیں پہنچتا جو اس کی کردار کشی سے پہنچتا ہے۔ لوگ قتل ہو جاتے ہیں؛ لیکن ان کے کام زندہ رہتے ہیں؛ بلکہ بسا اوقات قتل ہو جانے کے بعد ان کے مشن کو وہ عوامی حمایت اور ترقی حاصل ہو جاتی ہے جو قتل سے پہلے متصور بھی نہیں تھی؛ لیکن اگر کسی کی کردار کشی کر دی جائے، اس پر بُرے اور گھٹیا الزامات لگائے جائیں، تو اس کا مشن خطرے کی زد میں آجاتا ہے، اور بسا اوقات بند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نبی کو قتل کرنا انبیا علیہم السلام کی دعوت کو وہ نقصان نہیں پہنچاتا جو ان کی کردار کشی پہنچاتی ہے۔ نبی کو برے الزامات سے متصف کرنا صرف ایک شخص پر برے الزامات لگانے جیسا نہیں ہے؛ بلکہ یہ اس پورے دین اور پیغام پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے، جس کو لے کر اللہ نے انبیا علیہم السلام کو بھیجا ہے۔

بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ انبیا علیہم السلام پر الزامات لگانے والا پورے خدائی دین اور انبیائی مشن کے خلاف سازش رچ رہا ہوتا ہے۔

انبیا پر اتہامات لگانے میں سارے اہل کتاب شریک ہیں

افسوس کی بات یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام پر لگائے گئے ان الزامات میں سے بیشتر کا مواد عہد قدیم میں ہے جس پر یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کا ایمان ہے، اس لیے وہ سب اس کفر میں شریک ہیں، حتی کہ عیسائیوں کے بعض وہ چھوٹے فرقے بھی جو تثلیث کے کفر میں مبتلا نہیں ہیں، وہ بھی عہد قدیم پر ایمان رکھنے کی وجہ سے ان اتہامات کو صحیح مانتے ہیں۔

عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے انبیا پر لگائے گئے بعض الزامات مندرجہ ذیل ہیں:

الزام (۱) حضرت نوحؑ کا شراب پی کر برہنہ ہو جانا

کتاب پیدائش باب:۹، آیت: ۱۸ میں ہے:

''نوحؑ کے بیٹے جو کشتی سے نکلے سم، حام اور یافث تھے، اور حام کنعان کا باپ تھا۔ یہی تینوں نوحؑ کے بیٹے تھے، اور انھی کی نسل ساری زمین پر پھیلی۔ اور نوحؑ کاشت کاری کرنے لگے، اور اس کے ایک انگور کا باغ تھا اور اس نے اس کی مے پی، اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا، اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور دونوں بھائیوں کو باہر آکر خبر دی''۔ (۲۷)

اس عبارت میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ شراب پی کر اس حد تک بدمست ہوئے کہ برہنہ ہو گئے۔

الزام نمبر (۲) حضرت لوطؑ کا اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا

کتاب پیدائش باب:۱۹، آیت: ۳۰ میں ہے:

''اور لوط صُغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا، اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں؛ کیوں کہ اسے صُغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے، تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بُڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں؛ تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں، سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی، اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل

رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو؛ تا کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں، سو اس رات بھی انھوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی ، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی''۔

سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں، اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس کا نام موآب رکھا، وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں، اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمّی رکھا، وہی بنی عمون کا باپ ہے، جو اب تک موجود ہیں''۔(۲۸)

اہل کتاب نے یہ کہانی گھڑتے وقت اور اسے توریت میں داخل کرتے وقت یہ بھی نہیں سوچا کہ جن دو شخصیات موآب اور بن عمی کو اس کہانی میں ولد الزنا ثابت کیا گیا ہے، کسی نہ کسی حیثیت سے انھی کی نسل سے حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسی علیہم السلام جیسے انبیا ہیں؛ اس لیے کہ حضرت داؤدؑ کے دادا ''عوبید'' کی ماں ''راعوت'' موآب کی نسل سے ہیں، تو وہ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی بھی دادی ہوئیں۔ اسی طرح رحبعان بن سلیمانؑ جو حضرت عیسیٰؑ کے اجداد میں سے ہیں جیسا کہ انجیل متی کے باب: ا میں تصریح ہے، ان کی والدہ عمون کی اولاد میں سے ہیں جس کی تصریح کتاب سلاطین، باب: ۱۴ میں موجود ہے۔ اس طرح وہ حضرت عیسیٰؑ کی دادی ہوتی ہیں۔(۲۹)

توریت کے اس طرح کے من گھڑت الزامات نے اہل کتاب کے دلوں میں انبیا علیہم السلام کے حوالے سے کیا منفی سوچ پیدا کی، اس کا اندازہ حضرت لوط علیہ السلام کے سلسلے میں ایک عیسائی پادری کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''طریق الأولیاء'' میں حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں اس من گھڑت کہانی کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ''اس کی حالت پر سخت رونا آتا ہے، ہم سخت افسوس کے ساتھ اپنے دلوں میں خوف اور خشیت لیے ہوئے حیران ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو سدوم کی بستی کی تمام بدیوں اور گندگیوں سے پاک دامن رہا تھا اور اللہ کی راہ پر چلنے میں بڑا مضبوط تھا، اس شہر کی تمام نجاستوں سے ہزاروں کوس دور رہا تھا؛ مگر جنگل میں نکل جانے کے بعد اس پر ایک دم بدی اور فسق کا اس قدر شدید غلبہ ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کون شخص ہے جو کسی شہر یا جنگل وغار میں محفوظ رہ سکتا ہے''۔(۳۰)

الزام (۳) حضرت ایوب علیہ السلام نے بے صبری اور خدا کی شان میں گستاخی کی

حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر مشہور ہے جس کی مثال دی جاتی ہے؛ لیکن اہل کتاب اور عہد قدیم نے حضرت ایوب علیہ السلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ انھوں نے اپنی بیماری میں بہت بے صبری کی۔ جزع فزع کیا، حتی کہ اللہ کی شان میں حد درجہ نازیبا کلمات کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ساتھی سمجھاتے رہے کہ اللہ کی شان میں اس طرح کی باتیں نہ کہو؛ لیکن حضرت ایوب علیہ السلام نے ان کی بات نہیں مانی؛ بلکہ جب کسی نے سمجھایا تو طیش میں آ کر پہلے سے زیادہ نازیبا الفاظ کا استعمال کیا۔ کتاب ایوب، باب: ۳ میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے تفصیلی تذکرے کے بعد لکھا ہے:

''اس کے بعد ایوب نے اپنا منھ کھول کر اپنے جنم دن پر لعنت کی، اور ایوب کہنے لگا: نابود ہو وہ دن جس میں میں پیدا ہوا، اور وہ رات بھی جس میں کہا گیا کہ دیکھو بیٹا ہوا''۔(۳۱)

پھر دن ورات پر حضرت ایوبؑ کی طرف سے طویل لعنت وملامت کے بعد ہے:

''اس کی شام کے تارے تاریک ہو جائیں، وہ روشنی کی راہ دیکھے جب کہ وہ ہے نہیں، اور نہ وہ صبح کی پلکوں کو دیکھے؛ کیوں کہ اس نے میری ماں کے رحم کے دروازوں کو بند نہ کیا، اور دکھ کو میری آنکھوں سے چھپا نہ رکھا۔ میں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا؟ میں نے پیٹ سے نکلتے ہی جان کیوں نہ دے

دی! مجھے قبول کرنے کو گھٹنے کیوں تھے، اور چھاتیاں کہ میں ان سے پیوں!..... یا پوشیدہ اسقاط حمل کی مانند میں وجود میں نہ آتا۔ یا ان بچوں کی مانند جنھوں نے روشنی ہی نہ دیکھی..... دکھیارے کو روشنی اور تلخ جان کو زندگی کیوں ملتی ہے جو موت کی راہ دیکھتے ہیں پر وہ آتی نہیں..... کیوں کہ میرے کھانے کی جگہ میری آہیں ہیں، اور میرا کراہنا پانی کی طرح جاری ہے؛ کیوں کہ جس بات سے میں ڈرتا ہوں وہی مجھ پر آتی ہے؛ کیوں کہ مجھے نہ چین ہے نہ آرام، نہ مجھے کل پڑتی ہے؛ بلکہ مصیبت ہی آتی ہے''۔(۳۲)

دوسری جگہ ہے:

''میں اپنا منھ بند نہیں رکھوں گا۔ میں اپنی روح کی تلخی میں بولتا جاؤں گا۔ میں اپنی جان کے عذاب میں شکوہ کروں گا۔ کیا میں سمندر ہوں یا مگر مچھ، جو تو مجھ پر پہرا بٹھاتا ہے! جب میں کہتا ہوں میرا بستر مجھے آرام پہنچائے گا۔ میرا بچھونا میرے غم کو ہلکا کرے گا، تو تو خوابوں سے مجھے ڈراتا اور رویتوں سے مجھے سہما دیتا ہے، یہاں تک کہ میری جان، پھانسی اور موت کو میری ان ہڈیوں پر ترجیح دیتی ہے۔ مجھے اپنی جان سے نفرت ہے۔ میں ہمیشہ تک زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے چھوڑ دے، کیونکہ میرے دن بطلان ہیں۔ انسان کی بساط ہی کیا ہے جو تو اسے سرفراز کرے اور اپنا دل اس پر لگائے۔ اور ہر صبح اس کی خبر لے اور ہر لمحہ اسے آزمائے۔ تو کب تک اپنی نگاہ میری طرف سے نہیں ہٹائے گا! اور مجھے اتنی بھی مہلت نہیں دے گا کہ اپنا تھوک نگل لوں''۔

''اے بنی آدم کے ناظر! اگر میں نے گناہ کیا ہے، تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں، تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے''۔(۳۳)

ایک جگہ خدا کی شان میں حد درجہ گستاخی کے یہ الفاظ ان کی طرف منسوب کیے گئے ہیں:

''اگر وہ میرے پکارنے پر مجھے جواب بھی دیتا، تو بھی میں یقین نہ کرتا کہ اس نے میری آواز سنی۔ وہ طوفان سے مجھے توڑتا ہے، اور بے سبب میرے زخموں کو زیادہ کرتا ہے۔ وہ مجھے دم نہیں لینے دیتا؛ بلکہ مجھے تلخی سے لبریز کرتا ہے۔(۳۴)

اسی طرح ایک جگہ ہے:

''میری روح میری زندگی سے بیزار ہے۔ میں اپنا شکوہ خوب دل کھول کر کروں گا۔ میں اپنے دل کی تلخی میں بولوں گا۔ میں خدا سے کہوں گا: مجھے ملزم نہ ٹھہرا۔ مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے، اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے، اور شریروں کی مشورت کو روشن کرے؟ کیا تیری آنکھیں گوشت کی ہیں؟ یا تو ایسے دیکھتا ہے جیسے آدمی دیکھتا ہے؟ کیا تیرے دن آدمی کے دن کی طرح، اور تیرے سال انسان کے ایام کی مانند ہیں کہ تو میری بدکاری کو پوچھتا اور میرا گناہ ڈھونڈتا ہے''۔(۳۵)

ایک اور جگہ یہ الفاظ ان کی طرف منسوب کیے گئے ہیں:

''تو میرے خلاف نئے نئے گواہ لاتا ہے اور اپنا قہر مجھ پر بڑھاتا ہے۔ نئی نئی فوجیں مجھ پر چڑھ آتی ہیں۔ پس تو نے مجھے رحم سے نکالا ہی کیوں؟؟..... باز آ اور مجھے چھوڑ دے؛ تاکہ میں کچھ راحت پاؤں''۔(۳۶)

توریت کے برعکس قرآن کا واضح اعلان یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام اس ابتلا میں صابر رہے اور خدا کے حضور شکوہ کرنے کے بجائے مجسم صبر بنے رہے، اور خدا کے حضور گڑگڑاتے رہے۔

﴿ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ [ص: ٤٤]. ''بے شک ہم نے ان کو صابر پایا، بہت خوب بندے تھے کہ خدا کی طرف بہت رجوع ہوتے تھے''۔

قرآن کی اس صراحت سے ایک طرف عہد قدیم کی تحریف اور انبیا علیہم السلام کی شان میں اہل کتاب کی گستاخی کا پتہ چلتا ہے، تو دوسری طرف عہد قدیم اور قرآن میں اس واضح اختلاف کو جاننے کے بعد ایک مسلمان کے لیے عہد قدیم کو الہامی، آسمانی، غیر محرف اور انسانوں کی رہنمائی کے قابل کتاب سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

الزام (۴) حضرت یعقوب علیہ السلام کی خودغرضی

اہل کتاب کے بقول نبی کا بڑا بیٹا ہی اپنے باپ کی نبوت کا وارث ہوتا ہے، الا یہ کہ وہ اپنا پہلوٹھے کا حق کسی بھائی کو دے دے۔ اہل کتاب نے حضرت یعقوب علیہ السلام پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے خودغرضی سے اپنے بڑے بھائی عیسو کے پہلوٹھے کا حق لے لیا۔

کتاب پیدائش، باب: ۲۵، آیت: ۲۹ میں ہے:

''اور یعقوب نے دال پکائی۔ اور عیسو جنگل سے آیا۔ اور بے دم ہو رہا تھا۔ اور عیسو نے یعقوب سے کہا کہ یہ جو لال لال ہے، مجھے کھلا دے؛ کیوں کہ میں بے دم ہو رہا ہوں، اس لیے اس کا نام ادوم بھی ہو گیا۔ تب یعقوب نے کہا: تو آج اپنا پہلوٹھے کا حق میرے ہاتھ بیچ دے۔ عیسو نے کہا: دیکھ میں تو مرا جاتا ہوں۔ پہلوٹھے کا حق میرے کس کام آئے گا۔ تب یعقوب نے کہا کہ آج ہی مجھ سے قسم کھا۔ اس نے اس سے قسم کھائی اور اس نے اپنا پہلوٹھے کا حق یعقوب کے ہاتھ بیچ دیا۔ تب یعقوب نے عیسو کو روٹی اور مسور کی دال دی۔ وہ کھا پی کر اٹھا اور چلا گیا۔ یوں عیسو نے اپنے پہلوٹھے کے حق کو ناچیز جانا''۔ (۳۷)

حواشی

(۱۷) کچھ لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں میں بھی بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر گناہوں کے داغ ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مذکورہ عبارت اسی شبہے کا تشفی بخش جواب ہے۔

(۱۸) سیرت النبی: ۴/ ۶۹-۷۲ بتلخیص۔

(۱۹) اعمال بیکار ہونے کی اصطلاح عام طور پر قرآن میں کفر کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے، کوئی خاص عمل کسی وجہ سے تو اکارت ہو سکتا ہے، جیسے صدقہ احسان جتلانے سے بے کار ہو جاتا ہے؛ لیکن جب تمام اعمال کے اکارت ہونے کی بات ہو، تو یہ کسی کفریہ عمل ہی کی وجہ سے ہوگا۔ امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے: ''لا تحبط الأعمال بغير الكفر... لأن الأعمال إنما يحبطها ما ينافيها، ولا ينافي الأعمال مطلقا إلا الكفر... نعم قد يبطل بعض الأعمال بوجود ما يفسده كما قال تعالى: لا تبطلوا صدقاتكم بالمن والأذى، ولهذا لم يحبط اللّٰه الأعمال في كتابه إلا بالكفر''. (الصارم المسلول على شاتم الرسول: ١١٤).

(۲۰) الصارم المسلول على شاتم الرسول: ١٥.

(۲۱) الشفا بتعريف حقوق المصطفى، القسم الرابع، الباب الثالث: فصل في بيان ماهو من المقالات كفر.

(۲۲) الفتاوى الهندية: ٢/ ٢٨٥، كتاب السير، باب في أحكام المرتدين.

(۲۳) الإعلام بقواطع الإسلام: ٢٠٥، المطبوع في مجموعة ''الجامع في ألفاظ الكفر''.

(۲۴) سیرت النبی: ۴/ ۷۴۔

(۲۵) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب قول النبي ﷺ: أنا أعلمكم باللّٰه، رقم: ٢٠.

(۲۶) صحيح البخاري، كتاب الأيمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي ﷺ، رقم: ٦٦٣٧.

(۲۷) کتاب پیدائش، باب: ۹، آیت: ۱۸-۲۲۔

(۲۸) کتاب پیدائش، باب: ۱۹، آیت: ۳۰-۳۸۔

(۲۹) دیکھیے: بائبل سے قرآن تک: ۳/ ۳۹۹-۴۰۰۔

(۳۰) طریق الاولیاء: ۱۲۸، بحوالہ بائبل سے قرآن تک: ۳/ ۳۹۹۔

(۳۱) حوالۂ سابق، باب: ۳: آیت: ۱-۳۔

(۳۲) حوالۂ سابق، باب: ۳، آیت: ۹-۲۶۔

(۳۳) حوالۂ سابق، باب: ۷، آیت: ۱۱-۲۰۔

(۳۴) حوالۂ سابق، باب: ۹، آیت: ۱۶-۱۸۔

(۳۵) حوالۂ سابق، باب: ۱۰، آیت: ۱-۶۔

(۳۶) حوالۂ سابق، باب: ۱۰، آیت: ۱۷-۲۰۔

(۳۷) کتاب پیدائش، باب: ۲۵، آیت: ۲۹-۳۴۔

(.....جاری)

☆☆☆

تجزیہ

دورحاضر میں اسلامی فکر: توجہ طلب پہلو

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

نوٹ: مضمون نگار نے فکر اسلامی کے مختلف نئے گوشوں کی طرف رہنمائی کی ہے اور علما کو دعوت فکر دی ہے۔ بعض جگہ ان کی تحریر میں مغربی افکار سے مرعوبیت نظر آتی ہے۔ ان کی بہت سی باتوں اور آراء سے اختلاف کیا جاسکتا ہے؛ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ ترقی یافتہ دنیا نے اہل اسلام کے سامنے بہت سے نئے سوال پیدا کر دیے ہیں۔ اسلام پسندوں اور علماء کی ذمے داری ہے کہ وہ معاصر ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے ان سوالات کا جواب دیں۔ یہ وقت کا عظیم کام ہے۔ (ادارہ)

موجودہ دور میں اسلامی فکر کے میدان میں بہت کام ہوا ہے، خاص کر روایتی علوم کے احیاء کے سلسلہ میں۔ اس کی پوری قدر کرتے ہوئے اب کام کے نئے میدانوں اور نئی جہات پر توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔

ذیل کی سطور میں اختصار کے ساتھ اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس مجوزہ علمی کام کی دو سطحیں ہیں ایک عالمی دوسری قومی ومقامی۔ لیکن اس تحریر میں صرف عالمی مسائل سے بحث ہوگی۔ البتہ آخر میں ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلانی ہے جو عالمی بھی ہے اور مقامی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اختصار کی خاطر بعض نکات کی طرف صرف اشارے کیے گئے ہیں تفصیلی بحث سے گریز کیا گیا ہے اور بعض میں تھوڑی تفصیل کر دی گئی ہے۔ مقالہ میں پیش کیے گئے نکات غور وفکر کے لیے پیش کیے جارہے ہیں، وہ مصنف کی کسی حتمی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔

عالمی سطح پر:

سیاسیات: عصر حاضر میں اسلامی اجتماعیات کے میدان میں سب سے نمایاں اور ممتاز ترین نام مولانا سید مودودی علیہ الرحمہ کا ہے۔

۱۔ انہوں نے سیاسیات کے میدان میں بھی ایک تھیوری دی تھی کہ اسلامی سیاست نہ خالص تھیاکریسی ہے اور نہ خالص ڈیموکریسی۔ وہ ان دونوں کے بین بین کی چیز ہوگی۔ (۱) مولانا معاصر سیاسیات پر گہری نظر رکھتے تھے تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس اصطلاح کے بارے میں ان کا ذہن واضح نہ تھا کیونکہ ایک جگہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ نام کی یا اصطلاح کی کوئی اہمیت نہیں ''اس طرز کی حکومت کو موجودہ زمانہ کی اصطلاحوں میں آپ اسے سیکولر کہیے، ڈیموکریٹک یا تھیوکریٹک ہمیں کسی پر اعتراض نہ ہوگا''۔ (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد جو عصر حاضر میں نظام خلافت کے سب سے پرجوش داعی رہے ہیں، نے اِس پر مختصر اضافہ کیا اور اس نظام کی کچھ عملی صورتیں تجویز کیں۔ مگر اس بنیاد پر مضبوط عمارت اٹھانے کی ضرورت ہے جس پر ابھی کوئی توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔ (۳)

۲۔ جمہوریت میں اصل زور عام لوگوں کی شراکت اقتدار پر ہوتا ہے اس موضوع پر زیادہ مسلمان اہل علم نے خواہ مخواہ ہی حاکمیتِ الٰہ کی بحث چھیڑ دی ہے۔ جو سراسر ایک اضافی اور Relative مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلم اکثریتی ممالک میں حاکمیتِ الٰہ کو نظری طور پر تسلیم نہ کرنے کا کوئی سوال نہیں بحث عملی ہے۔ البتہ غیر مسلم اکثریتی ممالک میں حاکمیت الٰہ کا مطالبہ فضول ہوگا۔ پہلے تو ان کو ایمان کی دعوت کا مخاطب بنایا جائے گا۔

۳۔ دارالاسلام اور دارالحرب کی بحثوں سے

اسلامی فقہ کا ذخیرہ بھرا پڑا ہے مگر یہ اصطلاحات اپنے دور میں Relevant تھیں آج نہیں ہیں۔اب نئی اصطلاحات بنانے کی ضرورت ہے۔مثال کے طور پر مولانا وحیدالدین خاں دارالدعوۃ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں یا علامہ یوسف القرضاوی دارالعہد کی۔

۴۔اسلامی فقہ میں غیر مسلم شہریوں کے لیے ذمی،مستامن وغیرہ کی اصطلاحیں رائج ہیں مگر یہ شہریت کے موجودہ تصورات کے مطابق نہیں ہیں۔جدید ذہن اس جبر کو تسلیم نہیں کرتا کہ شہریوں کو مذہب کی بنیاد پر اول درجہ اور دوسرے درجہ کے شہریوں میں تقسیم کر دیا جائے۔آج کی نیشن اسٹیٹ میں تمام شہریوں کو دستوری طور پر یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔(۴)ہاں یہ بات صحیح ہے کہ عملی صورت حال بہت سے ملکوں میں اس کے بالکل برعکس ہے۔

سیکولرزم ایک فکری نظریہ اور عملی رویہ ہے جو مذہب کو انسانی زندگی سے خارج کرتا یا کم از کم اس کو نجی زندگی تک محدود کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ مسلمان اہل علم میں کوئی بھی اس نظریہ کی تائید نہیں کر سکتا۔مگر سیکولر اسٹیٹ ریاست کے ایک عملی بندوبست کا سوال بھی ہے خاص کر ان ممالک میں جہاں مختلف مذہبی اکائیاں رہتی ہوں۔مسلمان اہل فکر عام طور پر دونوں میں خلط ملط کر دیتے ہیں اور اس پر گومگو کا شکار ہیں۔البتہ عملی صورت حال تضاد فکری کی غماض ہے وہ یوں کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وہ سیکولر اسٹیٹ کی بھی جوش وخروش سے مخالفت کرتے ہیں اور جہاں اقلیت میں ہیں وہاں وہ اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کا دفاع وتحفظ کرتے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر مشیر الحق، مولانا وحیدالدین خاں اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری سیکولر اسٹیٹ کی تائید کرتے ہیں اور اس کو ہندوستان جیسے ملک میں نسبتاً ایک بہتر نظام سیاست خیال کرتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب نہ ہو، وہ کسی مذہب میں مداخلت نہ کرے بلکہ سبھی مذاہب اس کی نظر میں برابر ہوں۔غامدی صاحب نیشن اسٹیٹ میں مطلقا اس کی نفی کرتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب ہو۔(۵)

۵۔حدود کے سلسلہ میں ارتداد کی سزا کا تصور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک موجودہ زمانہ کی مذہبی آزادی اور اظہار رائے کی آزادی سے متصادم ہے اور قرآن کے صریح نص کے خلاف بھی۔یقیناً علماء اسلام کی اکثریت اسی کی قائل رہی ہے مگر اس بارے میں دوسری رائے بھی صدر اول سے ہی موجود رہی ہے جو بوجوہ دبی رہی۔کیا آج کے دور میں اس رائے کا اظہار موزوں نہ ہوگا؟ اور کیا اس پر کھلے بحث ومباحثہ کی ضرورت نہیں ہے؟(۶)

۶۔توہین رسالت کے قانون اور اس کے اطلاق کو عوامی ہاتھوں میں دینے کا تصور جدید ذہن کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔اس پر گفتگو ہونی چاہیے جس کا امکان مسلم معاشروں میں کم ہے۔پاکستان میں 1990 سے اب تک تقریبا 1500 لوگ اس قانون کے تحت گرفتار ہوئے ہیں۔اور تقریبا 700 لوگوں کو ماوراء عدالت عام لوگوں میں سے کسی نے اٹھ کر قتل کر دیا ہے۔جب کہ عدالت میں ان میں سے کسی پر بھی جرم ثابت نہ ہو سکا تھا اور عدالتوں نے ان کو بری کر دیا تھا۔(۷)پاکستان میں کسی پر بھی توہین مذہب کا الزام لگایا جا سکتا ہے اگر وہ مذہبی لوگوں کے رویے کو چیلنج کرے۔پاکستان کے لبرل مفکرین اور دانشور اس روایت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ خطرے کی زد میں رہتے ہیں۔پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کو توہین مذہب کے قوانین کی منسوخی کا مطالبہ کرنے پر ایک مذہبی انتہا پسند نے قتل کر دیا تھا۔جس کو آج مذہب پسندوں کی ایک کثیر تعداد اپنا ہیرو مانتی ہے۔

توہین مذہب کو جرم قرار دینے والے 71 ممالک میں سے 32 میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔لیکن مختلف ممالک میں اس سزا کا نفاذ مختلف ہے۔بعض ممالک نے ان سزاؤں کو Repeal کر دیا ہے اور بعض نے ان پر عمل درآمد کو منسوخ کر دیا ہے۔البتہ یہ عجیب وغریب بات ہے کہ ہولوکاسٹ پر سوال اٹھانا یا بات کرنا مغربی ممالک میں ممنوع اور قابل سزا ہے۔ایران، پاکستان، افغانستان، برونائی، موریطانیہ اور سعودی عرب میں توہین مذہب کی سزا موت ہے۔غیر مسلم

اکثریتی ممالک میں توہین مذہب کے سب سے سخت قوانین اٹلی میں ہیں، جہاں زیادہ سے زیادہ سزا تین سال قید ہے۔

ایک طرف تو یہ موضوع بہت حساس ہے۔ دوسری طرف یہ پہلو بھی سامنے رہے کہ کسی شاتم رسول کو قتل کر ڈالنے سے اہانت کے کیسوں میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ اسلاموفوبیا کی مہم کو اس سے اور مسالہ مل جاتا ہے۔ حالانکہ حنفی فقہ میں شاتم رسول کی سزا مطلقا موت نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے۔(۸) لیکن برصغیر میں امام ابن تیمیہ کی رائے کو عمومی طور پر قبول کرلیا گیا ہے اور اس پر اجماع کا دعوی بھی کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی بھی روایات آئی ہیں ان کے ظاہری مفہوم پر علما کی اکثریت اصرار کرتی ہے۔ اور مسلم اکثریتی ممالک میں اس طرح کے کیسوں میں مسلمانوں کا عمومی ردعمل شاتم کو فوری طور پر کیفر کردار کو پہنچانے کا ہوتا ہے جبکہ اقلیتی ممالک میں ان کا ردعمل زیادہ سے زیادہ احتجاجی مظاہروں تک محدود رہتا ہے۔ اس سے کھل کر اختلاف کا اظہار مولانا وحیدالدین خاں، جاوید احمد غامدی صاحب اور عمار خاں ناصر کے علاوہ کسی نے نہیں کیا۔(۹) بہت سے دوسرے علماء بھی یہی رائے رکھتے ہیں مگر عوامی ردعمل کے خوف سے وہ اس کا اظہار نہیں کرتے۔ مسلمان اس سلسلہ میں مغرب کی آزادیء فکر (جو کہ ان کے لیے تقریبا ایک مذہب ہے اور خیر اعلی (sumnum Bonum) سمجھی جاتی ہے) کی حساسیت کو نہیں سمجھ پاتے اور اہل مغرب ناموس رسالت سے متعلق مسلمانوں کی حساسیت کا ادراک نہیں رکھتے۔ اسی لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ مسلمان اہل علم کے درمیان اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہو اور اہل مغرب سے مکالمہ کی راہ کھولی جائے۔

اسی سے متعلق ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ نظری طور پر اہانت رسول کے قانون میں اللہ تعالیٰ، قرآن پاک، رسول اکرم ﷺ اور کسی بھی نبی کی اہانت شامل ہے اور مغرب میں حضرت عیسیٰ کو لے کر خوب اہانت ہوتی ہے مگر مسلمان عملاً صرف رسول اللہ ﷺ کی اہانت پر متشدد ردعمل کا اظہار کرتے ہیں؟ اصولی اور اخلاقی طور پر ان کو مطلقاً ہر نبی کی اہانت پر ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔

۷۔ جزیہ کا آج عملاً کوئی بھی اسلامی ملک غیر مسلم شہریوں سے مطالبہ نہیں کرتا۔ مگر علماء کرام اور فقہا اپنی تحریروں اور فتووں میں آج بھی اس پر زور دیتے ہیں اور یہی بتا رہے ہوتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کی تذلیل کے لیے لگایا جاتا ہے۔ بعض لوگ دوسری توجیہات بھی کرتے ہیں۔ مولانا عنایت اللہ سبحانی نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ جزیہ نہ عام لوگوں پر لاگو ہوگا اور نہ وہ غیر مسلموں کی تذلیل کا نشان ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جزیہ مغلوب غیر مسلم ریاست سے غالب اسلامی ریاست لے گی (۱۰) ہمارے خیال میں اس رائے پر غور کیا جانا چاہیے۔ اور کیا مسلم حکومتوں کا تعامل بھی بطور نظیر کام آسکے گا؟

اصل میں جب اسلامی فقہ کی تدوین شروع ہوئی تو اس وقت عالم اسلام وقت کا سپر پاور تھا اور پوری اسلامی ریاست ایک خلیفہ کے ماتحت تھی یا کم از کم نظری طور پر ایک خلیفہ کی اتھارٹی کو چیلنج نہ کیا جا رہا تھا اور مسلم سلاطین اس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے، ایسے ماحول میں فقہاء اسلام نے جو سیاسی اصول مدون کیے یا مسلم مفکرین سیاست نے جو تحریریں چھوڑیں وہ زیادہ تر نظری باتوں پر مشتمل ہیں اور عصر حاضر کے نت نئے مسائل کا ان میں کوئی مرتب حل نہیں پایا جاتا ہے۔ مثلاً اس سوال کا مدون اسلامی فقہ یا اسلامی سیاسی فکر جو جواب دیتی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ریاست جو مسلمانوں کے خلاف جارحیت کی مرتکب نہیں ہوتی تو اسلامی ریاست کے تعلقات اس کے ساتھ بھی محاربہ پر مبنی ہوں گے یا مسالمہ پر، وہ بہت زیادہ relivant نہیں۔ کہ فقہاء کی اکثریت بظاہر پہلی رائے کی حامل ہے جو موجودہ حالات میں قابل عمل نہیں۔(۱۱) مستشرقین اور ان کے ہم نوا بعض مسلمان اسکالروں کے نزدیک اسلامی فقہ تمام تر اسلام کی حکمرانی کی فضاء میں پروان چڑھی۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں کو اس صورت حال کے بارے میں تو تفصیلی رہنمائی دیتی ہے، جب وہ حاکم ہوں، لیکن جب مسلمان خود محکومی کی حالت میں ہوں یا

محکومی سے مشابہ حالت ہو یا تھوڑے بہت وہ خود بھی اقتدار میں شریک ہوں جیسے کہ ہندوستان میں ہے، تو ایسی صورت حال کے لیے مدون فقہ اسلامی رہنمائی دینے سے قاصر ہے۔ فقہ الاقلیات کی بحث اسی عملی صورت حال کی پیدا کردہ ہے۔(۲۱)

اسی طرح اقتدار کی منتقلی کا کوئی میکینزم اسلامی فکر میں نہیں ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے تاریخ اسلام کا بیشتر حصہ درباری سازشوں، خلیفہ وزراء اور امراء کی اقتدار کی رسہ کشیوں اور اس کے نتیجہ میں خون ریزی سے بھرا ہوا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلامی سیاسی فکر پر ابھی عصر حاضر کے تناظر میں بہت کام کیا جانا باقی ہے اور اس سلسلہ میں اجتہاد و تجدید فکر کی ضرورت ہے(۳۱) اِن مسائل پر سوچتے ہوئے اور نئی آراء قائم کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ آج ہم تمدنی و تہذیبی طور پر اس دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں مغرب کا غلبہ ہے۔ اس کے برعکس دنیا بنانے کا ہم خواب تو دیکھ سکتے ہیں لیکن ابھی واقع میں کوئی نئی اور الگ دنیا بنتی دکھائی نہیں دیتی۔

معاشرت:

خواتین کو اسلامی فقہ میں قریب قریب مثل باندی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ آج کے دور میں تملیک وغیرہ کی تعبیرات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ چہرہ کا پردہ کوئی دینی فریضہ نہیں ایک کلچرل مسئلہ ہے۔(۴۱)

ایک مبہم حدیث: عن ابنی بکرہ لما بلغ رسول اللہ ﷺ ان اھل فارس ملکوا علیھم بنت کسری قال: لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ ،رواہ البخاری (وہ لوگ جنہوں نے اپنے معاملات کا ذمہ دار کسی عورت کو بنا دیا ہے کامیاب نہ ہوں گے (جو خبر ہے یا انشاء یہ ہی طے نہیں) اور ناقصات عقل ودین والی روایت کو بنیاد بنا کر عورت کو علما ناقص العقل مانتے ہیں آج کا ذہن اِس کو تسلیم نہیں کرتا۔ مذہبی حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ عورت کو اعلی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اس کو تو گھر چلانا ہے گھریلو کام کاج کی تربیت دینی چاہیے۔ وہ محرم کے بغیر سفر نہیں کرسکتی۔ اس کو کسی سیاسی، تعلیمی، معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کی امامت، عورت کی قیادت وغیرہ کے مسائل ہیں۔ بغیر کسی قرآنی بنیاد کے یہ مان لیا گیا ہے کہ عورت کا دائرہ کار گھر ہے اور اس سے باہر وہ ضرورت کے وقت ہی نکلے گی۔

عصر رسالت میں ایسا کوئی ظاہرہ نہیں تھا کہ عورت ڈربہ میں بند نظر آئے وہاں تو معاشرہ میں اس کی چلت پھرت ہے اور خاتون پوری طاقت کے ساتھ معاشرہ کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے رہی ہے۔ جنگ کے میدان میں نظر آتی ہے تعلیم وتعلم کے میدان میں اور مارکیٹ میں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔(۵۱) آج جسمانی سے زیادہ عقلی صلاحتیوں کی ضروت ہوتی ہے کیونکہ انسانی زندگی کو مشین کنٹرول کر رہی ہے جس میں عورت مرد سے پیچھے نہیں ہے ایسے میں مرد وعورت میں تفریق کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اسلام میں عورتوں کے حقوق وذمہ داریوں کے سلسلہ میں جو لٹریچر لکھا گیا ہے اُس پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ایک Patriarchal (پدرسری) سوسائٹی کا بیانیہ ہے جس میں عورت کی حیثیت دوسرے درجہ کی ہے۔ اس سوال کو ایڈریس کرنے کی ضروت ہے۔(۶۱)

جدید کا سمولوجی کا چیلنج اور اسلام

موجودہ دور میں علم کلام کی طرف پھر ویسے ہی توجہ واعتنا کی ضرورت ہے جیسے کہ ماضی کے ائمہ وعلمانے کی تھی، لیکن آج ہماری ساری توجہ فقہ کی طرف ہوگئی ہے۔ اس چیز کی اہمیت ہمارے سامنے اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم معاصر دنیا میں مذہب اور سائنس کے تعامل پر غور کرتے ہیں۔ جدید کا سمولوجی جو سائنس وٹیکنالوجی نے تشکیل دی ہے اس نے مذہب کے روایتی موقف پر جو سوال کھڑے کر دیے ہیں ان پر غور فکر کرتے ہوئے پہلا اصولی مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ آج ارسطو کا وہ ورلڈ ویو جو سترہ صدیوں تک دنیا پر چھایا رہا مسترد ہو چکا ہے۔ اُس ورلڈ ویو میں زمین کائنات کا مرکز تھی۔ وہ ساکن تھی، سورج اس کے گرد چکر لگاتا تھا (پرانی ادبیات میں اسی لیے آسمان کو گردوں کہتے تھے) کائنات ارضی کا

مرکز توجہ، مخدوم اور امین انسان تھا بعض لوگ اس کو خلافت ارضی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔اس ورلڈ ویو میں اسلام کے حامی اور مخالف دونوں ایک ہی پیج پر تھے۔

آج جو ورلڈ ویو دنیا کو رول کر رہا ہے وہ گلیلیو، ڈیکارتے، نیوٹن، ہبل اور آئن اسٹائن وغیرہ کے نظریات اور تحقیقات پر مبنی ہے۔اس ورلڈ ویو کے مطابق زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، سورج اور دوسرے ستارے وسیارے اپنے اپنے محور پر گردش میں ہیں۔انسان کو کوئی خاص پوزیشن اس زمین پر حاصل نہیں۔بلینیوں کہکشاؤں پر محیط اس کائنات میں خود زمین ایک نقطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ارتقاء اور اب بگ ہسٹری کے تصورات نے مذہب کے نظریہ تخلیق اور انسان کی خصوصیت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔بگ بینگ یا نیچرل ارتقاء پر مبنی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ نہ اس کائنات کا کوئی مقصد ہے اور نہ انسان کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔یہ کائنات ومافیہا سب نیچر کے اندھے قوانین کے تحت وجود میں آئی اور ان ہی قوانین کے تحت اپنے آپ بے مقصد ختم بھی ہوجائے گی۔ایسے میں خدا کا وجود، حشر نشر آخرت وغیرہ کے تصورات سب غیر سائنسٹفک تصورات قرار پاتے ہیں۔مولانا وحیدالدین خاں کے ہاں اِس کے بارے میں غیر مرتب کام اور ابتدائی درجہ کا کام موجود ہے مگر اسے بہت آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جس کی طرف انجینئر سید سعادت اللہ حسینی نے توجہ دلائی ہے۔(۷۱)

مذہب انسان کی جو تاریخ اور کہانی بتاتا ہے وہ پانچ چھ ہزار سال سے پیچھے نہیں جاتی جبکہ بگ بینگ اور نیچرل ارتقاء پر مبنی تاریخ عظیم بتاتی ہے کہ کائنات کی عمر قریباً ۱۳، ارب سال ہے۔اس کے مطابق ہماری زمین سات ارب سال پہلے بنی اور اس پر زندگی کا وجود پانی میں تقریباً چار ارب سال پہلے ہوا۔لائف نے مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر بلینوں سال پہلے حیوانی قالب اختیار کیا۔ارلی مین اور نینڈرتھیل وجود میں آتے ہیں لاکھوں سال کے گزرنے اور نیچرل سیلیکشن سے گزرتے ہوئے وہ ہنٹنگ گیدرنگ کے مرحلہ میں پہنچتا ہے۔ایک لاکھ نوے ہزار سال ہنٹنگ اور گیدرنگ کے مرحلہ میں رہنے کے بعد وہ آئس ایج، حجری زمانہ سے گزر کر زراعت کے دور میں داخل ہوا اور ایک متمدن معاشرہ کی بنیاد پڑی۔زراعت کے بعد موجودہ صنعتی معاشرہ وجود میں آیا۔

تاریخ عظیم کی یہ کہانی بتاتی ہے کہ بایولوجی کے اعتبار سے مرد وعورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔مختلف معاشروں میں ہم جو فرق ان دونوں میں دیکھتے آئے ہیں وہ اصل میں کلچرل مؤثرات کی وجہ سے ہے اس کی کوئی حقیقی وجہ نہیں۔ہوموسپین کے مصنف کا کہنا ہے کہ:

''انسانی سماج میں مرد کے وظائف، عورت کے وظائف اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انسانی جسم کے مختلف اعضاء کے بامقصد وظائف کا تصور اَن نیچرل ہے۔وہ اصل میں مسیحی تھیولوجی سے آیا ہے ورنہ بایولوجیکلی کسی چیز کا کوئی مقصد اور ہدف نہیں ہوتا۔مرد قوام ہے اور عورت گھر کی ملکہ ہے وغیرہ تصورات اصل میں انسانی Imagination کے ساختہ ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر چیزوں کو imagine کرتا ہے۔چنانچہ یہ انسانی کلچر، ثقافت وتہذیب، مذہب وروحانیت، اخلاقی احساس وغیرہ یہ سب اس کی imagination کا نتیجہ ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں''۔(۸۱)

یہ کاسمولوجی کہتی ہے کہ تاریخ blindly سفر کرتی ہے اور اس کائنات اور اس پر زندگی کا کوئی مقصد نہیں، ایک دن یہ یونہی Blindly ختم بھی ہوجائے گی۔ظاہر ہے کہ یہ جو بیانیہ ہے یہ اپنے اندر مذہب، وجود باری تعالی وغیرہ کے کتنے بڑے چیلنج رکھتا ہے اور ہماری اس فتنہ سے مقابلہ کی تیاری کیسی ہونی چاہیے یہ کسی پر مخفی نہیں ہونا چاہیے۔

اور ایک مسئلہ مغربی سائنس وٹیکنالوجی کا یہ ہے کہ آج جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعہ یعنی انسانی جینوم کو کنٹرول کرنے کے پروگراموں کے ذریعہ یہ کوشش کی جارہی کہ اپنے من پسند انسان پیدا کیے جاسکیں۔کلوننگ کا عمل جو شروع میں ڈولی نامی بھیڑ پر کیا گیا اور اس کا ہمزاد پیدا کیا گیا تھا اب بات

اس سے بہت آگے بڑھ چکی ہے اور پیڑ پودوں، سبزیوں اوراناجوں سے گزرکراب حریم انسانی اس کی زدمیں آیاچاہتاہے۔جاپان میں مردوں کی آخری رسومات ایک روبوٹ انجام دے رہاہے، جرمنی میں چرچ کے اندرایک روبوٹ پادری کلیسائی مذہبی فرائض انجام دے رہاہے یعنی AI آرٹیفیشل انٹیلی جنس کے ذریعہ روبوٹ اب محض مشینی آلات نہ رہ کرانسانی ذہن وشعور کے حامل بھی ہوں گےاوروہ دن دورنہیں جب ہمارے امام ومؤذن روبوٹ ہواکریں گے۔کبھی فلموں میں اورفکشن میں روبوٹک بیویوں کی بات آیاکرتی تھی مگراب تووہ سچائی بن کرانسانوں کے سامنے آنے والی ہے۔توسوال ہماری فقہ کے سامنے یہ ہوگا کہ روایتی معاشرتی احکام اِن نئےقسم کےاورانوکھی نوعیت کے انسانوں پرکس طرح لاگوہوں گے؟ کیاوہ سرے سے شریعت کے مخاطب بھی رہ جائیں گے یانہیں؟ یاان کے لیےکوئی اورہی فقہ ڈولپ کی جائے گی؟(۹۱)

یہ آٹومیشن ایج اب آچکاہےجس میں نانوٹیکنولوجی پرمبنی آلات وسائل انسانی زندگی کوگورن کریں گے۔مسئلہ صرف اس کے مظاہرکے عام لوگوں کے دسترس میں آنے کا ہےجس میں اب زیادہ دیرنہیں لگےگی۔(۰۲)

انسانی زندگی میں مختلف جذبات کی بڑی اہمیت ہے اوربہت سے احکام بھی انہیں جذبات مثلاً محبت والفت، رحم ومہربانی، نفرت وکراہیت، غصہ وحسدوغیرہ کی بنیادپروجودمیں آتے ہیں۔انسانی تہذیب ان کی بنیادپرترقی کرتی ہے، سماجی رشتے ان سے بنتے بگڑتے ہیں۔اب ڈرگس اوردواؤں کے ذریعہ ان کوجذبات کوختم کرنے، ان کوکنٹرول کرنے یاان کوبدل دینے کی بات کی جارہی ہے۔حتی کہ ایک بڑاپروجیکٹ اس پرتحقیق کررہاہے کہ موت کا خاتمہ انسان کی زندگی سے کردیاجائے۔انسان کی زندگی کا دورانیہ بڑھادیاجائے وہ ہمیشہ جوان رہےاُسےکوئی مرض لاحق نہ ہووغیرہ۔اگرایساکسی بھی درجہ میں ہوجاتاہے تو اس سے روایتی فقہی احکام پر کیااثرپڑے گا کیاان چیزوں کوتغییرِخلق اللہ کی قبیل سے سمجھاجائے گایانہیں؟ ہمارے علما گزشتہ سوسال سے بھی زیادہ عرصہ سےتصویرکےمسئلہ سےالجھے ہوئے ہیں کہ آیافوٹو میں کسی شےکی حقیقت خودآجاتی ہے یااس کاعکس آتاہے؟ تصویراگرسرکٹی ہوتوجائزہوگی یانہیں؟ ڈیجیٹل کیمرے سے لیے گئے فوٹوپر حدیث میں آئی وعیدکااطلاق ہوگایانہیں وغیرہ۔سوال یہ ہے کہ اب سائنس وٹیکنالوجی جس دنیاکوسامنے لارہے ہیں اس میں ہمارے یہ فقہی قواعدوضوابط کچھ کام دیں گے؟ فی الحال کیتھولک چرچ کی مخالفت کی وجہ سے اورکچھ اوراسباب سے بعض ملکوں میں سائنس کوکچھ پابندکیاگیاہے اوراس کی تحقیقات پر کچھ قدغنیں عائدکی گئی ہیں مگرتابکے؟ جب یہ جن بوتل سے باہرآئے گاتونطشے نےتو God is dead کہہ دیاتھامستقبل قریب کا انسان فرعون کی زبان میں کہے گا کہ ''میں پیداکرتاہوں اورمارتاہوں اس لیے میں ہی خداہوں''۔یعنی سائنس داں ہی انا ربکم الاعلی کانعرہ لگائے گا۔

یہ نئی کاسمولوجی اورجدیدٹیکنالوجی کے وہ پہلو ہیں جوارتقااورنیچرل ہسٹری کی بنیادپرمذہب کے بالمقابل کائنات کے آغازوارتقاء اورزندگی کی تخلیق کا نیابیانیہ ہمارے سامنے لارہے ہیں۔(۱۲) یہ چیز اپنے اندرمذہب کے لیے کتنے خطرے لیے ہوئے ہے ہماری معروضات سے یہ بات کسی حدتک سامنے آجاتی ہے۔اب اہل مذہب کوسوچنایہ ہے کہ اس خطرے سے مقابلہ کی کیاتیاری ان کے پاس ہے؟ آج کا الحادسائنس کی بنیادپرکھڑاہے، ڈارون کا نظریہ ارتقاء سائنس دانوں کی اکثریت کےنزدیک ثابت شدہ ہے جبکہ مسلمان اہل دانش نے نظریہ ارتقاء کے علمی مطالعہ سے بہت کم اعتناکیاہے۔(۲۲)

ہندوستان:

وطن عزیزہندوستان میں انڈونیشیاکے بعدمسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی رہتی ہے۔ان کوگوناگوں مسائل ومشکلات کا سامناہے جس کا ایک پہلویہ ہے کہ آج کا پڑھالکھاہندوطبقہ اس بات پربہت زوردیتاہے کہ ہندودھرم چونکہ کسی کتاب کسی نبی اورکسی شریعہ(قانون)پرمبنی نہیں اس لیےاس

میں بڑی رواداری، برداشت، تسامح، وسعت نظری اور فراخ دلی پائی جاتی ہے۔ یہ مذہب اپنی نہاد میں سیکولر ہے اور متضاد لوگوں اور چیزوں کو اپنے میں سمونے اور ساتھ لیکر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص خدا کو نہ مانتا ہو اور مذہب میں یقین نہ رکھتا ہو وہ ہندو ہوسکتا ہے۔ ہندو مذہب کا یہ بیانیہ سیٹ کرنے میں سیکولر اور انتہا پسند ہندو دونوں ایک ہی پیج پر ہیں۔ مشرکانہ مذاہب کا یہ تصور کہ وہ کسی institutionalized مذہبی روایت پر قائم نہیں بہت سے مغربی ملحدوں کو بھی بہت بھاتا ہے اور وہ اس کے اس پہلو کی بڑی تعریف کرتے ہیں مثال کے طور پر مشہور مؤرخ اور ماہر مستقبلیات یوال نواحراری نے بھی اس کی بڑی تعریف کی ہے اور ابراہیمی مذاہب کے مقابلہ میں مشرکانہ مذاہب کو فوقیت دی ہے۔(۳۲) یہ تصور جو طرح طرح کی پابندیوں سے عبارت مذہبیت سے بے زار لوگوں کی اکثریت کو اپیل کرتا ہے حقیقت میں گمراہ کن ہے اس لیے اس نکتہ پر علمی و تاریخی بحث اور اس کی تردید کی خاص ضرورت ہے۔

حواشی وحوالے:

(۱) ملاحظہ ہو: مولانا سید ابوالاعلی مودودی اسلامی ریاست، مرتبہ خورشید احمد اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ ای ۱۳ شاہ عالم مارکیٹ لاہور ص502،

(۲) ایضا ص379

(۳) ڈاکٹر اسرار مختلف مروجہ نظامہائے سیاست اور ان کی ظاہری صورتوں کے بارے میں کہتے ہیں: ’’خلافت کا نظام صدارتی نظام سے قریب تر ہے ...... میں ہمیشہ کہتا آیا ہوں کہ پارلیمانی اور صدارتی دونوں نظام جائز ہیں، وحدانی unitary نظام وفاقی federal نظام اور کنفیڈرل confideral سب جائز ہیں ...... دنیا میں کئی سیاسی نظام چل رہے ہیں وحدانی صدارتی وفاقی صدارتی، وفاقی صدارتی (جیسے امریکہ میں ہے) کنفیڈرل صدارتی، پھر پارلمانی، وفاقی پارلیمانی اور کنفیڈرل پارلیمانی یہ چھ کے چھ جائز ہیں‘‘۔ دیکھیں ڈاکٹر اسرار احمد، پاکستان میں نظام خلافت، امکانات خدوخال اور اس کے قیام کا طریقہ کار صفحہ 36 مطبوعات تنظیم اسلامی پاکستان

(۴) حقوق المواطنہ فی الاسلام میں ڈاکٹر راشد غنوشی نے اِس مبحث کو کافی اجاگر کیا ہے اور تیونس میں اسے اختیار کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکوں میں ابھی اس خیال کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ البتہ پروفیسر نجات اللہ صدیقی بھی اسی رائے کے حامی ہیں۔ ملاحظہ ہو: اسلامی فکر چند توجہ طلب مسائل، شائع کردہ ہدایت پبلیکیشنز نئی دہلی، مولانا مودودی (اسلامی ریاست) مولانا سید جلال الدین عمری، (غیر مسلموں کے حقوق مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،) عبدالکریم زیدان احکام اہل الذمہ فی الاسلام نیز وہبہ الزحیلی (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلدے) کی بحثوں سے جدید ذہن کی تشفی کا سامان نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں یوسف القرضاوی کی آراء (فقہ الجہاد) بہت سے پہلوؤں پر نیا راستہ کھولتی ہیں۔

(۵) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر عبدالحق انصاری، سیکولرازم، جمہوریت اور انتخابات صفحہ 6-7)

Secularism Adn Islam Musheerul haq مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

مولانا وحیدالدین خاں، فکر اسلامی گڈورڈ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی، جاوید احمد غامدی، اسلام اور ریاست ایک جوابی بیانیہ مقامات طبع 2019 المورد (ہند)

(۶) مولانا عنایت اللہ سبحانی، تبدیلی مذہب اور اسلام، ادارہ احیاء دین بلریا گنج، جنوری 2002 طہٰ جابر العلوانی اشکالیۃ الردۃ فی الاسلام، ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی اسلام اور تبدیلی مذہب کا مسئلہ بعض نئے مطالعات کی روشنی میں، اشراق لاہور ستمبر 2018

-7 Blasphemy Laws Have Turned Muslim Countries into Killing Fields October Newageislam12 2021(https://www.newageislam.com/)

(۸) تفصیل کے لیے دیکھیں: مولانا عمار خان

ناصر حدود وتعزیرات، المورد لاہور

(۹) مولانا وحید الدین خان شتم رسول کا مسئلہ گڈ ورڈ نظام الدین نئی دہلی، جاوید احمد غامدی میزان المورد فاؤنڈیشن لاہور اور مولانا عمار خان ناصر حدود وتعزیرات، المورد لاہور

(۱۰) ملاحظہ ہو ان کی کتاب: جہاد اور روح جہاد اور جہاد اور آیات جہاد ہدایت پبلشرز نئی دہلی)

(۱۱) اس پر تفصیلی گفتگو کے لیے دیکھیں: عبدالحمید احمد ابوسل Towards An Islamic Theory of New :International Relations Directions for Islamic Methodology IIIT, :and Thought Washington 1993.

اور یوسف القرضاوی: فقہ الجہاد الجزء الاول مکتبہ وہبہ

(۱۲) ملاحظہ کریں: الشیخ عبداللہ بن محفوظ بن بیہ مشاہد من المقاصد رمؤسسۃ الاسلام الیوم الطبعۃ الاولی 2010 سعودی عربیہ اور نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی) یوسف القرضاوی کتاب الدین والسیاسۃ، خاص طور پر باب الاقلیات الاسلامیۃ والسیاسۃ

(۱۳) ملاحظہ ہو یوسف القرضاوی کتاب الدین والسیاسۃ، خاص طور پر باب الاقلیات الاسلامیۃ والسیاسۃ۔

(۱۴) دیکھیں: تحریر الرسالہ فی عصر الرسالہ، عبدالحلیم ابوشقہ اور اس کی تلخیص (ڈاکٹر عبداللہ الکلیبی) کا اردو ترجمہ شائع کردہ جوگا بائی نئی دہلی نیز شیخ البانی کی کتاب: حجاب المرأۃ المسلمۃ

(۱۵) پروفیسر یسین مظہر صدیقی، رسول اکرم اور خواتین ایک سماجی مطالعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی

(۱۶) ضرورت ہے کہ اسلامی فیمنزم کی اسکالر داعیوں امینہ ودود، سعدیہ یعقوب وغیرہ پر فتوے وغیرہ لگانے کی بجائے ان کو engage کیا جائے اور ان سے ڈائلاگ کیا جائے۔

(۱۷) ملاحظہ کریں امیر جماعت اسلامی انجینئر سید سعادت اللہ حسینی کا مقالہ: تحریکی لٹریچر اور درپیش علمی معرکہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور مارچ 2016

(۱۸) Yuval Noah Harihi Sapiens A brief History of Humankind p 122: Vintage Books London 2011

(۱۹) ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، کائنات کا آغاز وارتقاء: قرآنی بیانات اور سائنسی حقائق میں تطبیق کی راہ (تین قسط) ماہنامہ اشراق (ہند) مئی، جون جولائی 2021 المورد ہند فاؤنڈیشن

(۲۰) ملاحظہ ہو: سعادت اللہ حسینی امیر جماعت اسلامی کا مقالہ: تحریکی لٹریچر اور درپیش علمی معرکہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور مارچ 2016 اور ابو یحیٰ کا مقالہ چوتھا صنعتی انقلاب یا آٹومیشن ایج اشراق ستمبر 2021

(۲۱) ملاحظہ کریں: غطریف شہباز ندوی، جدید کاسمولوجی کا چیلنج اور فکر اسلامی اشراق لاہور اکتوبر 2019

(۲۲) دیکھیں: شعیب احمد ملک/غطریف شہباز ندوی اسلام اور نظریہ ارتقاء: ایک مختصر جائزہ تجدید شش ماہی جولائی دسمبر 2019 شمارہ ۲ جلد: ۱ انسٹی ٹیوٹ آف ریلیجس اینڈ سوشل تھاٹ شاہین باغ جامعہ نگر نئی دہلی اور نظریہ ارتقاء کے تفصیلی مطالعہ کے لیے: ڈاکٹر محمد رضوان ماہنامہ زندگی نو (جنوری 2021 اور اس کے بعد کی متعدد اقساط) نئی دہلی

(۲۳)۔ ملاحظہ کریں Yuval Noah Harihi brief History of Sapiens A Vintage Books 239:Humankind p London 2011

☆☆☆

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ، پاکستان دسمبر ۲۰۲۱ء)

❑ تجزیہ (قسط-۲)

اسلامی تحریک سیاسی تحریک ہے یا اصلاحی؟

تحریر: شیخ راشد الغنوشی ترجمہ: محمد فرید حبیب ندوی

تحریک اسلامی ان جملہ اجتماعی وانفرادی کوششوں میں نظر آتی ہے، جنھیں اسلام کے پیغام پر ایمان رکھنے والے ہزاروں مرد وخواتین ساری دنیا میں انجام دے رہے ہیں، اور ان کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کی اللہ سبحانہ وتعالی کی طرف رہنمائی کی جائے اور دلوں کو ہدایت ربانی سے منور کیا جائے، اور انفرادی واجتماعی طور طریقوں اور ہدایت ربانی کے درمیان تعلقات کو مضبوط کیا جائے۔ اور یہ کام اس طرح ہو کہ ہر انسانی سرگرمی ایسے اسلامی جذبات واحساسات کے ساتھ وجود پذیر ہو، جن کا مقصد اصلی، ہر فکر ونظر اور طور طریقے میں رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اور یہ چیز جب ہی حاصل ہوسکتی ہے، جب نفس کے ان جذبات کے مقابلے میں جو ہمیشہ پیچھے دھکیلتے ہیں، اور ان شیاطین الجن والانس کی رنگ آمیزیوں کے خلاف، جو ہمیشہ زندگی اور فکر وسلوک، سیاست ومعاشرت اور آداب وفنون کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں، ایک طویل انفرادی واجتماعی کشمکش میں کامیابی حاصل ہوجائے، اور ان تمام مذکورہ بالا چیزوں کو اسلامی تعلیمات اور قدروں کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ یہی اُس عقیدۂ توحید پر ایمان کا تقاضا بھی ہے، جو شرک کی ہر صورت کو رد کرتا ہے، اور وحدانیت کی دعوت دیتا ہے، اب چاہے اس وحدانیت کا تعلق ذات باری کو خالق وآمر ماننے سے ہو، یا اس کا تعلق حق وباطل اور حسن وقبح سے ہو۔ (اس میں وحدانیت یہ ہے کہ حق ایک ہی ہے)۔ اب جو چیز بھی اس عقیدے سے ٹکرائے گی، وہ تمرد علی اللہ اور شرک کی ہی ایک قسم ہوگی۔

انفرادی واجتماعی طور پر، روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں سے ایماناً وعملاً عقیدۂ توحید کا حصول اسلامی پیغام کا جوہر وخلاصہ ہے، اور یہی اس کوشش کا محور رہا ہے، جو ہر رسول نے اس عمارت کی تعمیر کے لیے انجام دی، جس کی آخری اینٹ رسول عربی، خاتم الانبیا ﷺ ہیں۔ اور توحید کا یہ درجہ اس وقت حاصل ہوگا جب اللہ واحد واَحد پر اس طرح ایمان لایا جائے کہ انسان کو اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اس کا استحضار حاصل ہوجائے۔ اور چونکہ ہر عمارت کی طرح اس عمارت کو بھی گرنے اور بوسیدہ ہونے کا خطرہ تھا، اور دوسری طرف اس کی تجدید کے سلسلے میں انبیاء کا رول بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم پر ختم ہو چکا تھا، تو یہ ذمہ داری امت محمدیہ کے حصے میں آئی، تاکہ وہ آخری وحی کی رہنمائی میں اپنی زندگی کے سفینے کو بذات خود چلائے۔ اور امت محمدیہ کی نمائندگی اس کے علماء کرتے ہیں، :''العلماء ورثة الأنبياء''۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر انبیاء کی کوششیں

عقائدی وفکری وتربیتی اصلاح پر موقوف تھیں اور اسی وسیع میدان میں ان کی کوششیں ختم ہوگئی تھیں۔ وہ دین کی بنیادوں پر اقتصادی وسیاسی واجتماعی زندگی کی تاسیس کے مرحلے تک نہیں پہنچ پائے، اس لئے کہ مادی فلسفوں کا بڑا زور تھا، اوران کے سبب سے پیدا ہونے والے رسم ورواج ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، حکومت کے ظالمانہ نظام پوری طرح ان کی حفاظت ونگرانی کرتے، اور ہر تجدیدی کوشش اور نبوی عمل کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے، انبیاء کے خلاف عوام کو بھڑکاتے اور بسا اوقات انھیں ہجرت پر مجبور کردیتے، یا انھیں قید کردیتے یا قتل کردیتے،''وإذ يمكر بك الذين كفروا ليثبتوك أويقتلوك أويخرجوك ''[انفال:۳۰]۔''وقال الذين كفروا لرسلهم لنخرجنكم من أرضنا أولتعودن في ملتنا ''[ابراہیم:۱۲]۔

رسولوں کی ایک قلیل تعداد ہی عقائدی وتربیتی اصلاح اور سیاسی اصلاح کے دونوں میدانوں میں کامیاب ہوسکی، چنانچہ ایسے رسولوں نے اپنی قوم کی آزادیٔ وطن کی تحریک میں بھی قیادت کی، جیسے حضرت موسی علیہ السلام۔ اگرچہ ان کی قوم میں ظاہر ہونے والی بعض ایسی خامیوں کی وجہ سے، جو ان کے نفوس میں بیٹھ چکی خست وذلت اور پست اخلاقی کو بیان کررہی تھیں، سیاسی کامیابی کا مرحلہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ آپ کی قوم کے لوگ آزادی کی تکالیف اور پیغام الٰہی کے بوجھ کو برداشت نہ کرسکے۔ ان کے دل تو تعیش اور خوش حال زندگی کے مشتاق تھے، تو ان کے انبیاء نے انھیں غصہ میں جواب دیا:''اهبطوا مصراً فإن لكم ما سألتم ،وضربت عليهم الذلة والمسكنة وباء وا بغضب من الله ''[بقرہ:۶۰]، بلکہ انھوں نے تو ایک بت پرست قوم کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے نبی سے بھی یہ مطالبہ کردیا کہ وہ ان کے لئے بھی اس قوم کی طرح کوئی معبود تراش دے:''اجعل لنا إلهاً كما لهم آلهة ''[اعراف:۱۳۷] اور جب فرعون سے نجات پانے کے بعد ان کا نبی دستور الٰہی لینے گیا اور وہاں سے واپس ہوا، تو اس نے دیکھا کہ اس کی قوم سونے سے بنے ایک بچھڑے کی پرستش میں گرفتار ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے ان سے اپنے ہاتھ جھاڑ لئے اور ان سے الگ ہوگئے، اور انھیں وادی تیہ میں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر حسرت وافسوس کی حالت میں ان کا وصال ہوگیا۔

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کا حصہ اگرچہ اصلاح عقیدہ وفکر اور سیاسی عمل دونوں میدانوں دیگر انبیاء سے زیادہ ہے، کہ ایک چھوٹے حصے میں ان کی حکومت بھی قائم ہوئی، مگر بنی اسرائیل اس حکومت کی حفاظت وحمایت سے پیچھے ہٹ گئے۔ اسی چیز نے حضرت سلیمان کو اپنے گھوڑوں اور لشکر سے چھٹکارا حاصل کرنے پر مجبور کیا:''فطفق مسحاً بالسوق والأعناق '' [ص:۳۲] اورانھوں نے رب تعالی سے دعا کی کہ ان دونوں کے بدلے انھیں تکوینی طاقتوں میں سے کوئی لشکر عطا فرمائے:''قال رب اغفرلي وهب لي ملكاً لاينبغي لأحد من بعدي،إنك أنت الوهاب ،فسخرنا له الريح تجري بأمره رخاء حيث أصاب، والشياطين كل بناء وغواص وآخرين مقرنين في الأصفاد ''[ص:۳۴-۳۷]۔ مذکورہ بالا تعبیر عقائدی وسیاسی اصلاح کے دونوں میدانوں میں بیک وقت کامیاب نہ ہونے کو واضح کررہی ہے، اور بتارہی ہے کہ اب یہ ذمہ داری دوسری امت کو دی جارہی ہے، اوران کی حکومت ومعاشرے کے ٹوٹنے اور وادی تیہ میں بھٹکنے کی کہانی سنارہی ہے۔

محمد ﷺ واحد نمونہ ہیں، جو اصلاح عقیدہ وتربیت اور سیاسی عمل دونوں میں بفضل الٰہی کامیاب ہوئے۔ایک طرف آپ نے عرب کے اجڈ لوگوں سے اوران کی زوال آشنا زندگی سے ایک منظّم وتہذیب یافتہ جماعت تیار کی، جس نے عقیدۂ توحید کے اسلامی پیغام کو،نظریہ سے آگے بڑھ کر عملی شکل عطا کی ،اور وہ حالتِ ضعف سے باہر نکل کر خلافت وقوت تک پہنچی۔اور آپ ﷺ نے ایک ایسی حکومت کی مضبوط بنیاد رکھ دی جو حجم میں تو چھوٹی تھی ،مگر اپنی بنیاد اور مقاصد واستعداد میں نہایت طاقت ور تھی۔یہ جماعت ایک مختصر مدت کے اندر عرب کے قدیم نظام کو ٹھکرانے میں کامیاب ہوگئی۔اور اب اس کے عقائد اور اجتماعی وسیاسی ڈھانچے بالکل تبدیل ہوگئے ۔ یہ حکومت وسیع ہوئی حتی کہ پہلی مرتبہ عقیدۂ توحید کی بنیاد پر پورے جزیرۂ عرب کو اس نے متحد کرلیا۔اس سے پہلے سابقہ نبوتیں اس میں کامیاب نہ ہوسکی تھیں،اگر چہ اس کا راستہ ہموار کرنے میں ان کا بڑا دخل ہے۔جب داعی اعظم ،خاتم النبیین نبی ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں،تو وحی مکمل ہوچکی تھی،اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا اجتماعی ڈھانچہ وجود میں آچکا تھا،جس کی اساس عقیدۂ توحید پر قائم تھی،اور جو اپنے اندر رنگ ونسل اور زبان ومذہب کے تمام اختلافات کو سمیٹے ہوئے تھے،اور آپ ﷺ عقل وفکر کی آزادی اور وحدت انسانیت کی مضبوط بنیادیں اپنے سامنے ہی رکھ چکے تھے،اور متفرق قدروں اور عقل وروح کو اور انسانی معاشرے کے مختلف سیاسی ودینی اختلافات کو وحدت کی ایک لڑی میں پرو چکے تھے۔

جس وقت بانی دعوت ﷺ کی وفات ہوئی ہے،تو حکومت کی یہ مضبوط بنیاد جزیرہ عرب سے باہر نکل کر ایران وروم تک پہنچنے کے لئے تیار تھی،اور اس کے لشکر کے وہاں پہنچنے سے پہلے اس کے انصاف کے قصے اور خوش خبریاں پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے۔آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء بھی آپ کے اسی نہج پر قائم رہے جو دینی وسیاسی اصلاح اور توحید وانصاف کا جامع منہج تھا۔انھوں نے اس حکومت کو مضبوطی عطا کی جو معاشرے کی خدمت اور ایمان وانصاف کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے برپا کی گئی ''الذین إن مکناھم فی الأرض أقاموا الصلوة وآتوا الزکوة وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ''[حج:۴۱]''وأمرت لأعدل بینکم ''[شوری:۱۴]''یا ایھا الذین کونوا قوامین لله شھداء بالقسط''[مائدہ:۷]۔

اموی انقلاب
دین کو سیاست سے جدا کرنے کی راہ میں پہلا قدم

دین وسیاست کی جامع اس منفرد نسل کو جس نے مدینے میں مثالی اسلامی معاشرے کی بنا رکھ دی تھی، برپا ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ زمانے کی سخت آندھیاں چلنی شروع ہوگئیں،اور قبائلیت اور ظالمانہ شہنشاہیت کے جذبات جنھیں اُس نسل نے شکست دی تھی،اپنی بحالی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے،اُس کے خلاف سازشیں شروع کردیں اور اس کے سرچشمے کو مکدر کرنے کی کوشش کی۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ بہت سی قومیں اور تہذیبیں اسلامی معاشرے میں اپنے سابقہ قبائلی وشہنشاہی اثرات وبقایا کے ساتھ شامل ہوئی تھیں،انھوں نے رائے عامہ میں اور معاشرے کے ڈھانچے میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا کردی،ایسی تبدیلی جس کے ذریعے قدیم عربی نظام کے حامی ،حکومت کے مزاج اور دین کے ساتھ اس کے تعلق کے سلسلے میں ایک ایسا بڑا انقلاب

پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے، جس کے ذریعے اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ دین وسیاست کی تقسیم کا خطرناک معاملہ سامنے آیا، اوراس کی وجہ سے مسلمان ایک جماعت سے نکل کر متفرق جماعتوں میں بٹ گئے۔ اوران کی حکومت معاشرے اور دین کی خدمت والی حکومت سے ایسی حکومت میں تبدیل ہوگئی، جس نے دین اور معاشرے سے خدمت کو نکال کر رکھ دیا اور جو اکثر وبیشتر طاقت کے زور پر اپنی حکومت نافذ کرتی۔

اور قریب تھا کہ اس قبائلی وشہنشاہی وراثت کی وجہ سے، جو اس وقت کے زمانے میں عام مزاج کی حیثیت سے چھائی ہوئی تھی، صاحب دعوت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ہی یہ انقلاب رونما ہوجاتا، چنانچہ اسی وقت مسلمانوں میں دوطرح کے نظریات پیدا ہوگئے تھے، ایک کہتا کہ ''ایک امیر تم میں سے اور ایک ہم میں سے ہونا چاہیے''، اور دوسرا امامت وخلافت کو خاندان نبوت کے ساتھ خاص مقدس میراث سمجھتا تھا، اور بہت سے قبائل مرتد بھی ہوگئے تھے، جنھوں نے اسلام کو محض ایک دینی دعوت کی حیثیت سے تو قبول کرلیا تھا؛ مگر وہ اسے ایک کامل ومکمل نظامِ حیات اور نظام حکومت کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہ تھے، اور انھوں نے باصرار زکوۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اسلامی تاریخ کی یہ سب سے پہلی مسلح سیکولر سرکشی وبغاوت اسلام کے تہذیبی منصوبے کو بالکل آغاز میں ہی دفن کردیتی اور اسے مسیحیت کی طرح محض چند رسوم ورواج پر مشتمل مذہب میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوجاتی، اگر اللہ تعالی حضرت صدیق اکبرؓ کو توفیق نہ دیتا اور وہ اس فتنے کا جڑ سے خاتمہ نہ کردیتے۔ حضرت صدیقؓ نے اس موقع پر جو فیصلہ کن قدم اٹھایا، اسے تاریخ میں ہمیشہ یادرکھا جائے گا، انھوں نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں ضرور بالضرور ان لوگوں سے جہاد کروں گا جو نماز اور زکوۃ کے درمیان تفریق کریں گے''، اور انھوں نے اس تفریق کو مرتدین کے خلاف جہاد کی سند ودلیل بنایا، اور پھر اس میں کسی طرح کی نرمی نہ برتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مرتدین دراصل اس آخری پیغام کے جوہر اصلی سے پھر گئے تھے، جس نے شرک کی تمام صورتوں کا، بالخصوص اس کی اجتماعی شکل کا جڑ سے خاتمہ کیا اور ایک ایسے اجتماعی وسیاسی نظام کی بنیاد ڈالی جو توحید کی اساس پر قائم تھا۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہ ارتداد بت پرستی کی طرف واپسی کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے کہ یہ بات تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تھی، بلکہ یہ دراصل اس جامع پیغام کے جوہر کو رد کرنا تھا، جو پیغام محمدی کا امتیاز ہے، یعنی سابقہ رسالتوں میں قائم دینی وسیاسی تفریق کو ختم کرکے ایسا نظام پیش کرنا جو دونوں کا جامع ہو، چنانچہ یہ ارتداد اسلام کی جامعیت کا منکر تھا اور گویا پھر سے بدویانہ ووحشیانہ زندگی کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔

اگرچہ حضرت صدیقؓ اپنے اس تاریخی اقدام سے تمردوسرکشی، توحید سے انحراف واعراض اور شرک کی طرف میلان کی آگ بجھانے میں کامیاب ہوگئے، اور انہوں نے اللہ کے دین کو اس انحراف سے بچالیا جو سابقہ رسالتوں میں ظالم بادشاہوں کے ہاتھوں در آیا تھا، اور اسی طرح وہ ایک ایسا درست تہذیبی واجتماعی ڈھانچہ قائم کرنے میں کامیاب رہے، جو حریت وعدل اور مساوات وامن پر مشتمل تھا، اور جو عوام کو اپنا حاکم منتخب کرنے کی آزادی دیتا تھا، مگر اُس وقت کی قبائلی وشہنشاہی روح نے خلافت راشدہ کے اس نمونے کو برداشت نہ کیا اور اس پر فوراً چڑھائی کردی۔ لیکن اس کے باوجود یہ نمونہ امت کے ذہن میں ہمیشہ ایک شاندار مثال کے طور پر موجود رہا اور اس بات کے امکان کو تازہ کرتا رہا کہ ایک بار پھر سے

ایسا نمونہ قائم کیا جاسکتا ہے، خواہ انسان ترقی کے کسی معیار پر پہنچ جائے۔ چنانچہ اس احساس نے ہمیشہ انقلابات کو جنم دیا، اور خواہ حکومتوں نے کیسا ہی ظلم کیوں نہ ڈھالیا، انقلاب کا جذبہ ہمیشہ باقی رہا۔ اور رہی تاریخ کی بات تو سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ تاریخ میں پیش آیا، وہ دراصل اس مثالی خلافت راشدہ اور زمانے کی موجودہ روح کے درمیان اتفاق کے نمونے تھے، جن پر قبائلی اور شہنشاہی اثرات غالب تھے۔

مثال وحقیقت اور جاہلیت واسلام کے اس مخلوط نمونے کے سلسلے میں اسلامی جماعتیں دو محاذوں میں بٹ گئیں، ایک ان سیاسی جماعتوں کا محاذ تھا، جنھوں نے موجودہ حکومت کے مقابلے میں مسلح سیاسی ٹکراؤ کی روش اپنائی، چنانچہ انھوں نے ان تمام چیزوں کو ٹھکرادیا جو امویوں نے منہجِ حکومت کے سلسلے میں اختیار کیں، جیسے انھوں نے حکومت کو شورائی خلافت سے، ایسی کسروی شہنشایت میں تبدیل کردیا، جس پر اسلامی رنگ چڑھا ہوا تھا۔

حکومت وقت کی مخالف یہ سیاسی جماعتیں ہمیشہ حکومت سے ٹکراؤ اور خون ریزی اور مسلسل کشمکش کے رویے پر قائم رہیں، اگر کبھی ایسا لگتا بھی کہ یہ جماعتیں چھپ گئی ہیں، تو فوراً نئی شکلوں میں جلوہ گر ہوجاتیں اور کسی بھی ایسی حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ نہ بڑھاتیں، جسے وہ نبوی، راشدی، توحیدی نمونے کے خلاف خیانت سمجھتیں۔ البتہ یہ چیز قابل لحاظ ہے کہ اگر خود ان جماعتوں کو بھی حکومت کرنے کے اسباب مہیا ہوئے تو یہ بھی کوئی بہترین نمونہ قائم کرنے میں ناکام رہیں؛ بلکہ انھوں نے سابقہ مثال کو اور زیادہ پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور اسی طرح کے نمونے قائم کیے جو اس وقت دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس کے باجود ہوا کہ ان جماعتوں نے حکومت حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں، مگر افسوس کہ یہ بھی کوئی اچھا نمونہ قائم نہ کرسکیں؛ بلکہ اموی انقلاب کی بعض مخالف جماعتیں جیسے جماعت شیعہ خود بھی شورائی نظام اور عوام کی حکومت سے بہت زیادہ دور اور ان قدیم نظاموں سے کہیں زیادہ ڈکٹیٹر شپ والی تھی، جن کی وہ مخالفت کرتی تھی۔ مثلاً شیعہ نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وجہ سے کہ حکومت نبی کریم ﷺ کے خاندان کے ایک خاص فرد کی رہے گی، جس کے بارے میں ہمیشہ کے لئے وصیت کردی گئی ہے، شوری کو ہی ختم کردیا، اور اس فرد کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ معصوم ہے، اس لئے وہ حاکم مطلق ہے۔ اور امام معصوم کی غیبوبت کے زمانے میں انھوں نے اس وصیت کا انطباق غیر معصوم پر کیا اور یہ خیال کیا کہ گو وہ غیر معصوم ہے، لیکن چونکہ وہ معصوم کا نائب ہے، اس لئے اس کے منصب پر معصومیت کا جلال باقی ہے۔ شیعہ کے اس نظریے کی وجہ سے ختم نبوت کے عقیدے پر شک وشبہ کے بادل چھانے لگے۔

اور خوارج جو کہ موروثی نظام کے سب سے سخت مخالف اور اس کی تردید میں سب سے آگے تھے، جب اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، تو اپنے مخالفین سے ہٹ کر کسی اور کسی ڈگر پہ نہ چل سکے، بلکہ انھوں نے بھی ایک دوسرا موروثی نظام ہی قائم کیا۔

ان دونوں سے ہٹ کر دوسرا محاذ جس جماعت نے قائم کیا، اور وہ غالب اکثریت میں تھے، انھوں نے حکمراں جماعت اور اپوزیشن کے درمیان حکومت کے لئے چلنے والی مسلسل خونیں کشمکش کے ہولناک نتائج کو دیکھ کر حکومت سے ٹکرانے کی پالیسی کو چھوڑ کر اسے ایک امر حقیقت کے طور پر تسلیم کیا، اور حکومت کی طرف سے اتنا ہی کافی سمجھا کہ وہ

شریعت اسلامی کا احترام کرتی ہے،اور علماء کو اصلاحی وتربیتی امور کی انجام دہی کی اجازت فراہم کرتی ہے، بلکہ انھیں اس کے لئے میدان مہیا کرتی ہے ،مسجدوں کی تعمیر اور تعلیم کی اشاعت ونظم کے لئے (اوقاف سے) فنڈ فراہم کرتی ہے،اور علماء آزاد ہوکر معاشرے کی خدمت کر سکتے ہیں، وہ محتاجوں کی دیکھ بھال،عمومی آفات سے معاشرے کی حفاظت اور لوگوں کے مفادات کے دفاع کا کام کر سکتے ہیں، حاکموں تک لوگوں کی شکایتیں پہنچا سکتے ہیں،اور حکمرانوں کو نصیحت کر سکتے ہیں۔

اس طرح اہل سنت یعنی مسلم اکثریت کے جمہور علماء نے خلافت راشدہ کے بعد قائم ہونے والے نظامہائے حکومت کو شرعی وقانونی قرار دیا،اور یہ سمجھا کہ موجودہ صورت حال کا جو کہ غلبہ وطاقت پر قائم ہے، یہی تقاضا ہے۔اورانھوں نے ایسااس لیے کیا؛ کیوں کہ ان حکومتوں نے شریعت کے احترام کا رویہ اپنایا اور علماء کو اصلاح معاشرے کی بھرپور آزادی دی تھی، گویا ایک طرح سے حکام اور علماء کے درمیان حکومت تقسیم کردی گئی،(کہ امور دنیویہ کی حکومت حاکموں کے پاس رہی اور امور دینیہ کی حکومت علماء کے سپرد کردی گئی)۔اور دراصل ماضی میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں اور خوں ریز جنگوں کے تجربات نے ہی اس تقسیم تک پہنچایا تھا۔اس کی وجہ سے علماء کرام نے یہی بہتر سمجھا کہ موجودہ قائم حکومت کو تسلیم کیا جائے،اور خود کو معاشرے کی اصلاح کے لئے فارغ کرلیا جائے۔اور-اس تقسیم واختیار کے منفی نتائج کے باوجود-اس کے بڑے مثبت اثرات بھی پڑے، چنانچہ اس کے نتیجے میں صناعت وثقافت اور تجارت سے مالامال مسلم معاشرے وجود میں آئے،اور علمی وتہذیبی ترقی کی اعلی شکلیں سامنے آئیں۔اور اس سب کی بنیاد انفرادی کوششوں اور اقدامات پر تھی،اور لوگ آزادانہ طور پر مختلف طرح سے کام کررہے تھے۔اس چیز نے مسلم معاشروں کو ثروت ومضبوطی اور ایسی خودمختاری عطا کی، جو حکومت سے بھی بڑھ کر تھی، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات حکومت کمزوری وفساد اور تنزل وادبار کے خطرناک مرحلے سے گذر رہی ہوتی،مگر معاشرہ ازدہار وترقی کی اعلی مثال قائم کررہا ہوتا اور عروج کے مزے لوٹ رہا ہوتا۔چنانچہ مدارس ومکاتب،مساجد وبازار ،صوفیانہ سلسلوں اور قبائل وجماعتوں کو مکمل خودمختاری حاصل تھی،اور اس کے علاوہ علماء کرام قضاء وافتاء اور تشریع کے عمل میں بالکل آزاد وخودمختار تھے، اور اس چیز نے حکمرانوں کو دین میں دخل اندازی سے روک دیا تھا۔اسی خودمختاری کا نتیجہ تھا کہ اعتماد الدولہ نے جب مؤطا کو سرکاری مذہب بنانا چاہا،تو امام مالک نے اس کی بات کو رد کردیا۔اور اسی طرح جب عباسیوں نے امت پر ایک خاص عقیدے کو تھوپنا چاہا تو امام احمد بن حنبلؒ نے اس کے خلاف بغاوت کی۔

(.....جاری)

☆☆☆

□ افکار و نظریات

مخلوط تعلیم

خالد سیف صدیقی

تعلیم انسان کا زیور ہے۔ تعلیم انسان کی زینت ہے۔ تعلیم انسان کو مہذب بناتی ہے۔ تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے۔ تعلیم انسان کو جینے مرنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ تعلیم معاشرے کو باعزت بناتی ہے۔ تعلیم اقوام کو سرفرازی اور سربلندی عطا کرتی ہے۔

آج تعلیم کا بڑا شہرہ ہے۔ آج تعلیم کا بڑا چرچا ہے۔ آج تعلیم کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر کوئی اپنی اولاد کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے۔ یہ قابل تعریف جذبہ ہے۔ مبارک باد آپ کو! مگر یہ تو بتایئے کہ عزت و آبرو کے ساتھ تعلیم حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اختلاط کے بغیر تعلیم حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ باپردہ اور باحیارہ کر تعلیم ممکن ہے یا نہیں؟ خوب یاد رکھیے! تعلیم گو ضروری ہے؛ مگر تعلیم کے لیے اختلاط ضروری نہیں ہے! تعلیم کے لیے بے حیائی، بے پردگی اور آوارگی ضروری نہیں ہے!

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مغرب میں جو عریانیت و فحاشی اور اسلام مخالفت پر مبنی طور طریقے اور طرز زیستن و مردن وجود میں آتے ہیں، وہ ہم تک پہنچتے پہنچتے 'فیشن'، 'جدید تہذیب' اور 'ماڈرن کلچر' جیسے پرفریب اور خوش نما نام پاجاتے ہیں، اور ہم ان کے ظاہری حسن اور مصنوعی رنگ و روغن کو دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور انہیں لپک کر قبول کر لیتے ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے مغرب کی جس عریاں، حیاباختہ اور اسلام مخالف تہذیب و تمدن کو قبول کیا، ان میں ایک نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط پر مبنی نظام تعلیم بھی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے 'مخلوط تعلیم' کے کیا مفاسد ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں 'مخلوط تعلیم' میں کیا قباحتیں ہیں؟ کیا آپ کو خبر ہے مخلوط تعلیم کے نتیجے میں معاشرہ کن حالات سے دوچار ہے؟ آیئے! ہم بتاتے ہیں مخلوط تعلیم میں کیا برائیاں ہیں، اور مخلوط تعلیم نے ہمارے معاشرے پر کیا قیامتیں ڈھائی ہیں! مخلوط تعلیم میں سب سے پہلی برائی تو یہ ہے کہ ہر وقت بدنظری اور بدنگاہی کا ماحول بنا رہتا ہے۔ ہر وقت نظر بازی چلتی رہتی ہے۔ ہر وقت لڑکیوں اور بچیوں پر ہوس ناک نگاہیں پڑھتی رہتی ہیں۔ ہر وقت ہوس ناک لڑکوں کی نگاہیں ان کے چہروں پر گڑی رہتی ہیں۔

اب یہاں پر ہم آپ سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی نوجوان بچی آپ کے سامنے ہو، اور کوئی شخص جو وہاں سے گزر رہا تھا، اتفاق سے اس کی نظر آپ کی بچی پر پڑ گئی۔ پھر وہ رک گیا۔ تھم گیا۔ ذرا قریب آیا، اور آپ کی بچی کو

تکنے لگا، آپ کی بچی کو گھورنے لگا، اور اپنی طرف مائل کرنے لگا۔ سچ بتایئے گا! کیا اس شخص کی اس حرکت سے آپ خوش ہوں گے؟ کیا آپ اس کا استقبال کریں گے؟ کیا آپ اس کا شکریہ ادا کریں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں! آپ کھا جانے والی نظروں سے اس کو دیکھیں گے۔ آپ کو غصہ آجائے گا۔ آپ آپے سے باہر ہوجائیں گے۔ آپ آگ بہ گولہ ہو جائیں گے۔ آپ کا خون کھول جائے گا۔ آپ کا دل کرے گا، اس بیشرم کی آنکھیں پھوڑ دوں! آپ کا جی چاہے گا، اس ہوس کے پجاری کو سامان عبرت بنا دوں! آپ کا جی کرے گا، اس کمینے کو کاٹ کر رکھ دوں! اب ہم عرض کرتے ہیں، ناراض مت ہوئیے گا! محترم! یہی کچھ تو آپ کی بچیوں کے ساتھ آپ کی آنکھوں سے دور اسکولوں، کالجوں اور مخلوط تعلیم گاہوں میں ہو رہا ہے؛ لکہ اس سے بڑھ کر ہو رہا ہے! جناب! پھر آپ کو غصہ کیوں نہیں آتا؟ آپ آگ بہ گولہ کیوں نہیں ہوتے؟ پھر آپ کا خون کیوں نہیں کھولتا؟

دوسری برائی یہ ہیکہ جن بچوں اور بچیوں میں اس ماحول میں جانے سے پہلے کچھ تھوڑی بہت شرم وحیا ہوتی ہے، اس حیاباختہ ماحول میں جانے کے بعد، وہ بھی ان سے چھن جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر کسی بھی خلاف حیا عمل کو انجام دینا ان کے لیے قابل عار نہیں رہتا۔

تیسری برائی یہ ہے کہ عام طور سے لڑکے اور لڑکیاں پیار محبت اور عشق ومعاشقے میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس ماحول کا شاید ہی کوئی لڑکا یا لڑکی ہو، جس کی جنس مخالف سے یاری اور تعلقات نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔

تعلیم چوپٹ ہو جاتی ہے۔ والدین بے چارے اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ بچہ یا بچی پڑھ رہی ہے؛ مگر وہ کاہیکو پڑھتے، ان کو تو کوئی اور ہی مشغلہ راس آیا ہے۔ اب تو اسکول اور کالج بھی آجا رہے ہیں تو پڑھائی کے مقصد سے نہیں؛ بلکہ یاری، دوستی اور عشق ومعاشقے کے تقاضے سے!

آپ ذرا سوچیئو! نوجوان لڑکا، نوجوان لڑکی، اور دونوں ایک ساتھ اٹھ بیٹھ رہے ہیں، دونوں ایک ساتھ کھا پی رہے ہیں، دونوں ایک ساتھ گھوم پھر رہے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ کیا یہ دونوں بھائی بہن ہیں؟ کیا یہ دونوں میاں بیوی ہیں؟ کیا یہ دونوں محرم ہیں؟ نہیں نہیں! لڑکا انجان، لڑکی انجان، لڑکا اجنبی، لڑکی اجنبی! پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا تعلق؟ یہ کیسی یاری؟ یہ کیسا میل ملاپ ؟؟ معاملہ کیا ہے؟ ماجرا کیا ہے؟ قصہ کیا ہے؟ تماشا کیا ہے؟ کوئی کچھ تو بتائے!

ہم یہاں پر ایک چھوٹے سے اعتراض کا جواب بھی دے دینا چاہتے ہیں۔ جب ہم، لوگوں کے سامنے مخلوط تعلیم کی برائیاں بیان کرتے ہیں، اور انہیں اس سے روکتے ہیں تو وہ بڑھ کر کہتے ہیں 'ہمارے پاس جداگانہ تعلیم گاہیں نہیں ہیں؛ اس لیے ہم مخلوط تعلیم گاہوں میں ہی اپنی بچیوں کو تعلیم دلاتے ہیں، اگر تم جداگانہ تعلیم گاہیں بنا دو، تو ہم اپنی بچیوں کو ان میں داخل کر دیں۔

اللہ کا شکر ہے! قوم مخلوط تعلیم پر مصر تو نہیں ہے۔ مخلوط تعلیم کے لیے بہ ضد تو نہیں ہے۔ مجبوراہی تو وہ ایسا کر رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم کیوں کر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ تعلیمی ادارے قائم کر سکتے ہیں؟ ہمارے پاس اتنی وسعت کہاں ہے؟ ہمارے پاس اتنے اسباب و وسائل کہاں ہیں؟ لہذا صرف ہماری ہی تخصیص کیوں ہو؟ آپ بھی خدا کا نام لے کر میدان میں اتریے! آپ بھی اپنی ہم دردی کا ثبوت پیش کیجیے! مل جل کر ہی تو کوئی کام ہوگا۔ فرد واحد اور شخص واحد سے

بھلا کیا کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے! (قوم کے لیڈروں قائدوں اور رہنماؤں کو اس حوالے سے بہ طورِ خاص فکر مند ہونا چاہیے)

جداگانہ نظام تعلیم کا قیام کیوں کر ممکن ہے؟ لگے ہاتھوں اس حوالے سے ہم ایک دو مفید مشورے بھی دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یاد رکھیے! جس طرح مخلوط نظام تعلیم کا قیام مشکل نہیں، اسی طرح جداگانہ نظام تعلیم کا قیام بھی مشکل نہیں! چناں چہ اس حوالے سے ہمارا پہلا مشورہ ان اداروں کے لیے ہے جن میں مخلوط نظام تعلیم چل رہا ہے، اور وہ یہ کہ ان اداروں کو انتظامی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مطلب یہ کہ اگر ادارے میں ایک سو 'کلاس روم' ہیں تو پچاس لڑکوں کے لیے خاص کر دیے جائیں، اور باقی پچاس لڑکیوں کے لیے۔

دوسرا مشورہ ان اداروں کے لیے ہے، جن کا آئندہ قیام ہوگا، اور وہ یہ کہ ادارے اس منصوبے کے تحت قائم کیے جائیں کہ نصف ادارہ لڑکوں کے لیے خاص ہوگا اور نصف لڑکیوں کیلیے۔ یا پھر اس ارادے کے ساتھ کہ پورا کا پورا ادارہ یا تو لڑکوں کے لیے مخصوص رہے گا یا لڑکیوں کے لیے۔ اس طرح کچھ ادارے صرف لڑکوں کے لیے اور کچھ صرف لڑکیوں کے لیے قائم کر دیے جائیں، تو دونوں جنسوں کو ادارے میسر ہو جائیں گے، اور یوں دونوں کے لیے تعلیم ممکن ہو جائے گی۔

مخلوط تعلیم کی مذکورہ بالا برائیوں اور قباحتوں کے علاوہ ابھی حال میں جو مسلم لڑکیوں کے ارتداد کا فتنہ اٹھا تھا (جس کا تسلسل اب بھی کسی نہ کسی درجے میں برقرار ہے) جس کی بنا پر بے شمار اسلام کی 'شہزادیاں' اسلام کو خیر باد کہہ کر دشمنان اسلام کی گود میں جا بیٹھیں۔ جس کے سبب ملت اسلامیہ ہند یہ بدنام ہوئی، اور جس کی وجہ سے شرمندگی سے ہمارا سر زمین میں گڑ گیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے، اس کے اسباب کیا تھے؟ کیا آپ جانتے ہیں، ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے جہاں ک ءاسباب ہو سکتے ہیں، ایک بڑا سبب مخلوط تعلیم بھی ہے! اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں مسلم و غیر مسلم لڑکے اور لڑکیاں سب ایک ساتھ رہتے سہتے ہیں، سب ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایسے میں دشمنان اسلام کو ان دختران اسلام کو بہلانے، پھسلانے اور دام فریب میں پھسانے کا اچھا موقع ملا۔ نتیجتاً وہ ہوا جس کا ہم نے اور آپ نے بڑی ناگواری سے مشاہدہ کیا۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد، کیا ہمیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہمیں مخلوط تعلیم کے حوالے سے سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہمیں اپنی بچیوں کو اب بھی مخلوط تعلیمی اداروں میں ڈالنا چاہیے؟ کیا ہمیں ان کی عزت و آبرو اور دین وایمان کی فکر نہیں کرنی چاہیے؟

ہے کوئی جو ہماری باتوں پر کان دھرے؟ ہے کوئی جو ہماری پکار پر لبیک کہے؟ ہے کوئی جو ہماری تائید میں اٹھ کھڑا ہو؟ ہے کوئی جو اپنی بچیوں کی خیر خواہی چاہے؟ ہے کوئی جو اپنی بچیوں کو مغرب کی نہیں، اسلام کی 'شہزادیاں' دیکھنا چاہے؟ ہے کوئی جو اپنی بچیوں کو عائشہ اور فاطمہ کے قدموں میں ڈال دے؟ ہے؟ ہے کوئی؟ (اقبال سے معذرت کے ساتھ)

اے کاش! اتر جائے ترے دل میں مری بات!

☆☆☆

تاریخ کا سبق اور وقت کا تقاضا

انس مسرور انصاری

قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں بے شمار قومیں پیدا ہوئیں۔عروج وارتقاء کی منزلوں سے ہم کنار ہوئیں، رفعت وسربلندی نے اُن کے قدم چومے، لیکن طاقت واقتدار کا نشہ طاری ہوا تو غرور ونخوت میں مبتلا ہوئیں، خود پرستی اور خدا فراموشی کو اپنا شعار بنالیا، خدا کی قائم کردہ حدوں سے اجتناب کیا۔ ہر اُس برائی کو اختیار کیا، رواج دیا جو قوموں کے زوال کا سبب ہوتی ہیں۔آرام طلبی و عیش کوشی اور غفلت و بے خبری میں ایسے کھو گئیں کہ اُنھیں اپنی ذات اور اپنی طاقت کے سِوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔اُن کے علماء اور دانشور بھول گئے کہ انسان کا مقصودِ حیات کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت کا گناہ کیا۔دربار گیری، حاشیہ برداری اور جاہ طلبی اُن کی زندگی کا مقصد ومشن بن گئے۔وہ بھول گئے کہ خدا نے اُنھیں دینی ودنیاوی منفعت بخش علوم سے سرفراز کیا ہے۔ دینی ودنیاوی سعادتیں عطا فرمائیں تو قوم کی صحیح رہنمائی کا ذمّہ دار بھی ٹھہرایا۔مگر وہ اپنی رہنمایانہ حیثیت کو فراموش کر بیٹھے۔طرح طرح کی لغویات اور خرافات کے اسیر ہوگئے۔اس کے بعد بھی خدا نے اُنھیں سنبھلنے اور پھر سے راہِ راست پر چلنے کے مواقع بار بار عطا کیے۔لیکن جب اُن کی نادانیاں اور نافرمانیاں قدرت کے آئین سے متصادم ومتجاوز ہونے لگیں ،ٹکرانے لگیں تو زوال کو اُن کا مقدر کر دیا گیا۔پھر وہ تباہ وبرباد ہوگئیں۔اُن کا نام ونشان تک مٹ گیا۔بعض قوموں کو تاریخ کے صفحات میں بھی پناہ نہ مل سکی اور نیست ونابود ہوگئیں۔

مصر کی فاطمی خلافت، بغداد کی خلافتِ عباسیہ اور خلفائے اسپین کے جاہ وجلال اور سربلندی وسرفرازی کی مثال نہ تھی۔اُن کے خلفاء یورپ کے بڑے حصے پر قابض ہوگئے تھے۔دنیا کے نصف سے زیادہ حصوں پر اُن کا تسلّط تھا۔ وہ دینی ودنیاوی سعادتوں کے امام تھے۔یورپ کے کسی حکمراں کو اُن سے آنکھیں چار کرنے کی مجال نہ تھی۔اُن میں ہمت تھی، بہادری اور شجاعت تھی، اُن کے بازو توانا تھے، نہ وہ خود چین سے بیٹھتے اور نہ اپنے عسکریوں کو آرام کا موقع دیتے، وہ خود بھی متحرک رہتے اور اپنی عسکری طاقت کو بھی متحرک رکھتے۔ خشکی پر بھی وہ مقتدر تھے اور سمندروں پر بھی حکمراں۔عدل وانصاف، امن ومساوات، خدا ترسی، اتحاد واتفاق اور اسلامی تہذیب وتمدّن کے وہ نگراں ومحافظ تھے۔

انھوں نے علوم وفنون کو بہت فروغ دیا۔زندگی کے ہر شعبہ میں کارہائے نمایاں کیے۔پھر اُن کے بعد اُن کے جانشین آئے اور محل سراؤں میں اسیر ہوکر عیش پرستی میں مبتلا ہوگئے۔اُن کے بازو کمزور ہوگئے۔اُن کی طاقت گھٹتی گئی۔وہ مخلوقِ خدا سے غافل ہوکر شراب وشباب کے ہوش ربا

طلسم میں کھو گئے۔ یہ اُن کا آخری گناہ تھا۔ پھر اُنھیں قدرت نے معاف نہیں کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے اُس نام نہاد خلافت کو ختم کر دیا اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ملّتِ اسلامیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارا مل گیا۔ قوموں کے زوال کے اسباب مختلف ہیں لیکن عیش پرستی اور مخلوقِ خدا سے بے نیازی مشترک ہے۔

بلاشبہ عہدِ عباسیہ میں علوم وفنون کو بڑی ترقی ملی۔ بہت بڑے بڑے فلاسفر اور سائنس داں پیدا ہوئے جن کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں علمِ کلام کو عروج حاصل ہوا، اور خلقِ قرآن کا فتنہ کھڑا ہوا۔ بہت سے حق پسند وحق پرست علماء وصالحین شہید کر دیے گئے۔ مامون رشید نے اُنھیں حق بیانی کے جرم میں سزائیں دیں۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ہمنواؤں کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، یہاں تک کہ وہ جاں بحق ہو گئے۔ مامون رشید کے بعد بھی یہ فتنہ پُر جوش طریقے سے جاری رہا۔ یہ خلفاء قرآن کو مخلوق مانتے تھے۔ اُن کے حامی مصلحت پسند علماء کی تعداد کثیر تھی۔ پھر ایسے اسباب وعوامل پیدا ہوئے کہ یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔ جس علم الکلام کی بنیاد پر یہ فتنہ کھڑا ہوا تھا، وہ علم مسلمانوں کو بہت مرغوب ومحبوب تھا۔ خلافتِ عباسیہ کے آخری عہد میں علم کلام نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ اُس کی بنیاد پر مناظروں کی گرم بازاری شروع ہوئی۔ مسجدوں میں مناظرے۔ شاہراہوں اور بازاروں میں مناظرے۔ مسلکی مناظرے۔ نسلی مناظرے۔ ارضی وسماوی مناظرے۔ قسم قسم کے مناظرے ومباحثے۔ طرح طرح کے موضوعات پر اِن مناظروں نے دیگر علوم کی اہمیت کو کم کر دیا۔ پوری قوم مناظرہ بازی کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن علم الکلام ہو یا کوئی دوسرا علم، اپنے آپ میں اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کم ظرف آدمی کو علم حاصل ہو جائے تو وہ اُس کو اپنے مزاج ومذاق کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ اگر مزاج صالح نہ ہو تو عالم کا علم بھی شیطانی خرافات کا سرچشمہ ہو جاتا ہے۔ شہرت اور معیشت کی طلب علمی سچائی کو کھا جاتی ہے۔ علم کا غلط استعمال بہت برے نتائج سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ اُس دور کے شہرت طلب علمائے سُوٗ نے اپنے اصل کام دعوت وتبلیغ اور فروغِ دین وملّت کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اپنی عسکری طاقت سے غافل آخری دَور کے خلفاء اپنی حرم سراؤں میں شراب وکباب کی لذتوں اور حسن وجمال کی رعنائیوں میں ایسا گرفتار ہوئے کہ پھر رہائی نصیب نہ ہو سکی۔ اپنے تحفظ اور بقاء کے جس تابوت میں یہ کیلیں ٹھونکتے آئے تھے، چنگیز خاں نے اُس میں آخری کیل ٹھونک دی اور خلافتِ عباسیہ کا نام ونشان مٹ گیا۔ مسلمان چُن چُن کر قتل کیے گئے۔ معصوم بچوں کو نیزوں پر اُچھالا گیا۔ چنگیز خاں خدا کا قہر بن کر نازل ہوا۔ زمین اپنی تمام تر فراخیوں کے باوجود مسلمانوں پر تنگ ہو گئی۔

خلافتِ اسپین کے زوال کے اسباب بھی مذکورہ دونوں خلافتوں سے مختلف نہ تھے۔ قریب آٹھ سو سالہ اس خلافت کو نااہل اور نالائق بادشاہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کفن پہنا دیا۔ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ وہ ذلّت کے ساتھ اسپین سے نکال دیے گئے۔ عیسائیوں نے اُن کے عبادت خانوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کر لیا اور باقی مساجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا۔ یہ اُس قوم کا انجام ہے جس کے بزرگوں کی بخشی ہوئی علم کی روشنی سے سارا یورپ جگمگا رہا ہے۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کا عروج تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر تک اس سلطنت کی حدود میں اضافہ ہوتا رہا۔ کوئی طاقت مغلوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ اورنگ زیب نے پچاس سال تک نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ اس کے بعد حکمراں

طبقہ آپسی اختلافات کا شکار ہوگیا۔کشمیر سے کنیّا کماری اور رنگون سے کابل تک پھیلی ہوئی اس عظیم الشان سلطنت کے زوال کے اسباب بھی کچھ مختلف نہیں ہیں۔ اورنگ زیب کے بعد کئی بادشاہوں نے تخت وتاج کو سنبھالا مگر اُن کا بوجھ اُٹھانے کی طاقت کسی میں بھی نہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح عیش پرستی، بزدلی، خوابِ غفلت اور علمی انحطاط کی وجہ سے عظیم مغل سلطنت سمٹتے سمٹتے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں صرف دہلی تک محدود ہوگئی۔بس لمبے لمبے القاب باقی رہ گئے۔جب کلکتہ سے انگریزی فوج دہلی کی طرف بڑھ رہی تھی اور منزلوں پر منزلیں سر کرتی ہوئی دہلی کی طرف چلی آرہی تھی اُس وقت بوڑھا اور کمزور بادشاہ اپنی عسکری طاقت کا جائزہ اور اسلحوں کی درستی اور فراہمی کے بجائے شطرنج کھیلنے اور غزلیں کہنے میں مصروف تھا۔اُس کے حاشیہ نشین شعراء ومصاحبین اُس کی شان میں قصیدے کہہ کہہ کر اُسے گمراہ کررہے تھے۔اُس مجبور اور بے بس دعا گو بادشاہ کو ظلِّ الٰہی اور سلطانِ عالم کے القاب سے پکارتے تھے۔دشمن منزل بہ منزل بڑھتا چلا آرہا تھا اور بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے اور قسم قسم کے جانور پالنے اور ان سے دل بہلانے میں مست تھا۔بچی کھچی فوج کو تنخواہیں نہیں مل پاتی تھیں۔اسلحے زنگ آلود ہو گئے تھے۔بادشاہ شاعرانہ ومتصوفانہ تخیّلات کی دنیا میں فرار ہوگیا۔حقیقت یہ ہے کہ اُس کی حالت اُس شترمرغ جیسی ہوگئی تھی جو خطرہ محسوس کرتے ہی ریت میں گڑھا کھود کر اپنے سر کو چھپالیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ دشمن کی نگاہوں سے محفوظ ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر عہد کی دہلی میں عوام اور خواص کی خصوصی تفریحات کے دو بڑے ذرائع تھے۔ایک تو مشاعرے اور دوسرے طوائفوں کے مجرے۔خاقانیِ ہند ذوقؔ دہلوی اپنی بلاغت، مرزا غالبؔ اپنی فکری اور فلسفیانہ بصیرت، مومنؔ اپنی معاملہ بندی ورومان پسندی اور داغؔ اپنی سادگی وفصاحت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔مشاعروں کی محفلیں بڑے پیمانے پر برپا ہوتیں۔طوائفوں سے مجرے سننا، ان کے بالاخانوں پر جانا، رسم وراہ رکھنا تہذیب وشرافت میں داخل تھے۔اپنے بچوں کی تہذیبی تربیت کے لیے طوائفوں کی خدمات حاصل کرنا اس زمانے کے شرفاء کی خاص امتیازی شان تھی۔اُس زمانہ میں ''اودھ اور شاہانِ اودھ'' کا بھی یہی عالم تھا۔نزاکت ایسی کہ سامنے کھیرا یا ککڑی کاٹ دو تو زکام ہوجائے۔اپنے اقتدار کے لیے قوم کا سودا کرنے والے ان عیش پرستوں نے قوم کو بیچ دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی شہروں پر شہر اور قصبوں پر قصبے فتح کرتی ہوئی تیزی سے دہلی کی جانب بڑھ رہی تھی مگر دہلی والے طوائفوں سے مجرے سننے اور مشاعروں میں شعراً کو داد وتحسین سے نوازنے میں مصروف تھے۔مشہور ہے کہ مرزا داغؔ نے دہلی میں شاعری کا وہ جادو جگا رکھا تھا کہ سامعین اُن کی غزلیں سن کر مسحور ہوجاتے۔کہتے ہیں کہ جب داغؔ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تو داد وتحسین کے شور سے مشاعرہ گاہ کی چھتیں اُڑ جاتیں۔ذوقؔ وغالبؔ، مومنؔ وداغؔ کے علاوہ اردو اور فارسی کے بہت سے اہلِ کمال وفن جو ذہانت وذکاوت اور لیاقت وصلاحیت کے اعتبار سے اعلاترین معیار پر تھے، زندگی بھر شعر کہتے اور داد وتحسین وصول کرتے رہے۔اسی پر وہ خوش تھے، قانع ومطمئن تھے۔جن کے شعروں پر مشاعرہ گاہ کی چھتیں اُڑ جایا کرتی تھیں اور جو بہترین دماغ اور اعلا صلاحیتوں کے مالک تھے۔اپنی قوم کے لیے کوئی ایسا علمی وتعمیری کارنامہ نہ کرسکے جس پر آج ان کی قوم فخر کرسکتی۔سو دو سو غزلوں کے بجائے انسانیت کی ترقی اور تحفظ کے لیے صرف ایک تھیوری اور سائنٹفک نظریہ دے جاتے تو آج پوری انسانیت ممنونِ احسان ہوتی۔حد تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو افیون دے کر سُلا رہے تھے، جب 1857ء میں قوم پر سامراجی مظالم کی جابرانہ افتاد پڑی تو یہی لوگ قوم کو غنودگی کی

حالت میں چھوڑ کر حصولِ عیش و معاش کے لیے دوسری ریاستوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔قدرت نے انھیں اعلا دماغ اور بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔زمانہ شناسی کی لیاقت عطا کی تھی۔یہ لوگ چاہتے تو قوم کے لیے بہت کچھ کرسکتے تھے مگرانھوں نے کچھ نہ کیا۔ زندگی بھراپنی خداداد صلاحیتیں غیرضروری سمتوں میں صرف کرتے رہے۔وہ ایسے محاذ پراپنی ذہانت کا مظاہرہ کرتے رہے جہاں اُن کی زوال پزیر قوم کوکوئی بھی فائدہ پہنچنے والا نہ تھا۔

اسی طرح منصورحلاّج کی زندہ کھال کھینچی گئی۔ کیونکہ انھوں نے اپنے اندرخدا کو پایا تھا۔باب کو1850ء میں ایران میں اس لیے گولی ماردی گئی کہ وہ اپنے آپ کوامام موعود سمجھتے تھے۔مرزاغلام احمدقادیانی نے انکشاف کیا کہ مسیح وکرشن کی روح اُن کے اندرحلول کرگئی ہے۔مگر یہ لوگ جومابعدالطبیعاتی دنیامیں اتنی بلند پروازی دکھارہے تھے،اُن میں کوئی ایک شخص بھی ایسانہیں پیداہواجوانسانیت کوسائنٹک علوم میں کوئی نیاطریقہ یانئی دریافت دے جاتا۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد برصغیر میں مسلم قوم کے زوال کی رفتار بڑھتی ہی گئی۔ایسا لگتا ہے کہ اس قوم کے زوال کی کوئی حدہی نہیں کہ جس پر نشاۃ ثانیہ کی بنیادقائم ہو۔یہ قوم ابھی زوال پزیر ہے اورزوال یا فتگی کے آثارتک نظرنہیں آرہے ہیں۔اس قوم نے ایسے علماء اوردانشورنہیں پیداکیے جواس کارخ اس کے اصلی مرکزومحوراورمرجع کی طرف موڑدیتے۔اس کامقدربدل دیتے۔قوم فرقوں،طبقوں اور برادریوں میں بٹ گئی۔منتشرہوگئی۔اس کی ساری قوت بکھرگئی۔زندگی کے ہرمحاذپرنا کام ونامرادہوگئی۔

دوسروں کے لیے نفع بخشی ہمیشہ ایثاروقربانی،بھلائی وخیرخواہی،بھائی چارگی اوراحساسِ ذمّہ داری کی بنیادپرممکن ہےلیکن اس قوم نے اس جذبہ واحساس کوبھی کھودیااور بھول گئی کہ وہ جن کی محبت کادم بھرتی ہے۔جن کادامن نہ چھوڑنے کی بار بار قسمیں کھاتی ہے،اللہ کے اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے بار بارفرمایاہے کہ مسلمان،مسلمان کا بھائی ہے،اس کے لیے وہی کچھ پسندکرے جووہ خوداپنے لیے پسندکرتاہے۔''اس قوم نے اجتماعیت اوروحدت کے اس بنیادی سبق کوفراموش کردیا۔یہ بھی بھول گئی کہ خدا کاوعدہ ہے کہ وہ نافرمان قوموں کومٹادیتاہےاورایسی قوم کواسلام کی توفیق عطافرماتاہے جو اس سے بہتر ہوتی ہے۔اپنی انفرادیت کوکھوکرمسلم قوم نے غیرقوموں کے شعارکواپنالیا۔ان کی مماثلت ومتابعت اختیارکی۔عیسائیوں نے اپنی عبادت کے لیے ہفتہ میں ایک دن اتوارکومقررکررکھاہے توعام مسلمانانِ برصغیرنے خداکی عبادت کے لیے ہفتہ میں ایک دن''جمعہ'' کومخصوص کرلیاہے۔مسلمانوں کی اکثریت اسی ایک دن خداکی عبادت کرتی ہے۔اس قوم نے یہودیوں سے ''سودخوری ،عیسائیوں سے''لباس''اوراہلِ ہنودسے ذات اورشخصیت پرستی کے علاوہ ان کی سماجی برائیوں کوبھی رضاورغبت کے ساتھ قبول کرلیاہے۔اب اس قوم کے پاس اس کااپنا کیا بچا۔؟یہ سوال خود ہی اپناجواب ہے۔

زندگی کی ہرسطح پرقوم کے علماء اوردانشوراس کے نگراں ومحاظ ہوتے ہیں۔ان کی حیثیت رہنمایانہ ہوتی ہے۔وہی قوم کوصحیح راستوں کی طرف لے جاتے ہیں۔صحیح خطوط پرچلاتے ہیں۔ یہ ان کی ذمّہ داری ہے۔لیکن کیاخیرِ اُمّت کی صورت میں یہ ذمّہ داری پوری کی جاری ہے۔؟ یہ ایک بڑااوراہم سوال ہے۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ فرقوں،طبقوں،برادریوں اورمزیدگروہوں میں بٹی ہوئی منتشر قوم نے اپنے تہذیبی وتمدّنی اورمعاشرتی نظام کے

تارو پود بکھیر لیے ہیں۔اپنی ساری اچھائیاں دوسری قوموں کو بخش کر اُن کی ساری برائیاں ،خرافات اور مذموم رسوم ورواجات کو اپنے معاشرہ میں رائج کرلیا۔نصرانیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے بہت سے طریقے اپنالیے۔اس قوم کا اپنا کیا بچا۔؟

قرآن بھی خدا بھی رسولِ کریم بھی
کُل کائنات اس کی ہے لیکن فقیر ہے

اس کی ایک مثال ''جہیز'' جیسی کافرانہ بدعملی ہے۔اسلام سے جس کا کوئی تعلق نہیں۔یہ خالص ہنودی رسم ہے جو سناتن دھرم سے جڑی ہوئی ہے اور جو کسی بھی معاشرہ کے لیے کینسر جیسی مہلک بیماری ہے ،مسلمانوں نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے معاشرتی نظام کا لازمی حصّہ بنالیا اور اُن کے علماء ودانشور خاموش ہیں۔دیمک کی طرح چاٹ جانے والی جہیز کی رسم نے مسلم سماج کو ناخواندہ وپسماندہ بنادیا۔جہیز کی اسی لعنت کی وجہ سے آج مسلم بچیاں غیر مسلموں کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے پر مجبور ہیں۔ ان کے باپوں کے پاس ''جہیز'' کی استطاعت نہیں ہوتی۔زندگی میں ہم سفر کی ضرورت بھی ناگزیر ہے۔یا پوری زندگی تنہائیوں کی نذر ہوجاتی ہے اور سارے سہانے خوب مرجاتے ہیں۔اسی کے سبب بچے تعلیم سے محروم ہیں۔بچیوں کو خدا کی رحمت کہا گیا ہے۔لیکن جب یہ رحمت نازل ہوتی ہے تو لوگوں کے چہرے فق ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ انھیں بچیوں سے پیار نہیں۔کبھی کبھی تو بچوں سے زیادہ اپنی بچیوں کو پیار کرتے ہیں۔مگر کیا کریں کہ جہیز کا بوجھ ان کی کمروں کو دہرا کردیتا ہے۔اسی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے وہ بچوں کو تعلیم کے بجائے کام پر لگالیتے ہیں تاکہ اپنی بچیوں کے لیے جہیز کی رقم جمع کرسکیں۔زمانۂ جاہلیت میں وحشی عرب اپنی بچیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔مگر ہمارے زمانے میں انھیں پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا اور ماں کے شکم ہی میں دفن کردیا جاتا ہے۔جہیز کی اس رسم اور دیگر خرافات نے پورے مسلم معاشرہ کی دھجیاں بکھیر رکھی ہیں۔سارا کرپشن اسی سے پھیلا ہوا ہے۔جہیز کا بوجھ نہ ہوتو ہر باپ چاہے گا کہ اس کے بچے تعلیم حاصل کریں۔آگے بڑھیں،ترقی کریں۔

بھارت کی ''سچر کمیٹی'' کی رپورٹ کہتی ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بدتر ہے۔ وہ خطِ افلاس سے نیچے ہیں۔مگر ان کے مصلحین کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔مسلم پرسنل لاء بورڈ بڑے بڑے فتوے جاری کرتا ہے لیکن مسلم معاشرہ کو تباہ وبرباد کرنے والی رسوم خاص طور پر ''جہیز جیسی لعنت اور بارات جیسی لغویات پر کوئی فتویٰ جاری نہیں کرتا۔تباہیوں اور بربادیوں کا ایک سیلاب ہے جس میں یہ قوم بہی چلی جارہی ہے۔جو لوگ اس بہاؤ کو روک لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں،وہ بھی اسی میں بہے چلے جارہے ہیں۔ غیر ضروری محاذوں پر سرگرم ہیں۔اقبالؔ نے کہا تھا۔''تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔''لیکن اس قوم کا حال یہ ہے کہ اس کے زوال اور پستیوں کا سلسلہ ہی ختم ہونے میں نہیں آرہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کے لیے نمونے کا ایک مثالی معاشرہ قائم کیا تھا اور اُسے عملی طور پر پیش فرما کر مسلمانوں کو تاکید فرمائی تھی کہ اسے قائم رکھیں اور اسلام کی سادگی کو کبھی فراموش نہ کریں۔وہ معاشرہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا ضامن تھا۔اس نے بڑے بڑے ریفارمر اور ہیروز پیدا کیے جو پوری دنیا پر اثر انداز ہوئے۔جس میں جہیز جیسی خرافات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ نہ بارات اور نہ گاجے باجے کا کوئی تصور تھا۔ ہاں،''ولیمہ'' کی تاکید فرمائی گئی۔خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالا عنہا کا نکاح حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو انھیں جہیز نام کی کوئی چیز نہیں

دی۔ جو کچھ دیا وہ حضرت علی کو دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اُن کے کفیل اور سرپرست تھے۔ نکاح کے سارے اخراجات حضرت علی نے ادا کیے تھے۔ بارات کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ بعد کے زمانے میں جب دولت کی ریل پیل شروع ہوئی تو مسلمانوں نے اُس فلاحی معاشرہ کو مسترد کر دیا اور وہی کچھ کیا جو یہودیوں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا تھا کہ نبی ورسول کو تو مانیں گے لیکن اُن کے فرمودات پر عمل نہیں کریں گے۔ اس نافرمانی پر اللہ تعالانے یہودیوں پر لعنت بھیجی۔ یہودیت اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اپنے نبی ورسول کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جائیں اور خدا کا شریک تک ٹھہرا دیا جائے مگر اُن کی ہدایات پر عمل نہ کیا جائے۔ کیا مسلمان لعنت زدہ یہودی قوم کی راہ پر چل نکلے ہیں۔؟ نافرمانی، خودغرضی، بیایمانی، لالچ، ہوس، ریاکاری، شرابنوشی، عیش پسندی، سودخوری، ناانصافی، وعدہ خلافی، عدم مساوات وصلہ رحمی، دھوکہ، مکر، فریب، تن آسانی، قتل وخون اور غارت گری۔! وہ کون سی برائی ہے جس کی لعنت میں مسلم قوم گرفتار نہیں۔ پھر بھی محبتِ رسول کا دعویٰ ہے اور اس کے لیے جھوٹی قسمیں کھائی جارہی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اللہ ورسول کے تمام تر واسطوں کے باوجود جب دعائیں نامقبول ہوجاتی ہیں تو قوم شکایت پر آمادہ ہے کہ ”برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر“۔ اپنی ذات کے خول میں بند ذاتی مفاد پرستی میں مبتلا اس قوم کو نہ جانے کب اپنے محاسبے کی توفیق عطا ہوگی۔ ہوگی بھی یا نہیں۔ کیا پتا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کا دم بھرنے والی قوم اپنی ناجائز خواہشات کی غلام بن گئی۔ زندگی کا ہر پہلو تاریک ہو چلا ہے۔ کاش! اس تاریکی سے نور کی کوئی کرن اُبھرے اور عالمِ امکاں کو روشن کردے، جس کی بنیاد پر مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ قائم ہو۔ کاش۔!

ہیں دل محروم ضرب لاالہ سے
صدف تو ہے گہر باقی نہیں ہے
نمازیں ہیں مگر بے ذوق سجدے
اذاں ہے پر اثر باقی نہیں ہے

(انس مسرور)

یاد رکھئے! قوم کے علماء ودانشور قوم کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ یہ چاہیں تو قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچالیں اور یہ آنکھیں بند کرلیں تو کشتی تو ڈوب ہی رہی ہے۔ آج قوم میں ہر سطح پر قیادت کا فقدان ہے۔ صوفیہ اپنی خانقاہوں میں مصروف ہیں اور علماء ودانشور اپنی اپنی درس گاہوں میں اپنے اپنے فکری دائروں میں محصور۔ قوم لاسمتیت کا شکار حیران وپریشان ہے۔ بے آبرو، بے راہ۔ کوئی رستہ ہے نہ رہبر نہ کوئی [illegible] سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے“۔

صوفی نہ اُٹھا خانقاہ سے اپنی
ملاّ نہ اُٹھا درس گاہ سے اپنی
معلوم یہ سب کو ہے کہ قومِ مسلم
ہٹ کے چلتی ہے راہ سے اپنی

☆☆☆

□ ذکرِ سلف

بے محنت پیہم

محمد سراج اکرم قاسمی
(مدیر مدرسہ الہدایہ کنشا سا، تعلیمی نگراں دی مسلم فاؤنڈیشن آف کونگو)

ہمارے ذہن و دماغ میں آج کل یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ ہمارے اسلاف نے جو علمی ترقیاں کیں اور علم وفن کے جس بام عروج پر پہنچے، اس کے پیچھے ان کے زبردست حافظے کی قوت کارفرما تھی، انھیں سوسو حدیثیں بیک دفعہ سننے سے یاد ہوجایا کرتی تھیں، ہزار حدیثوں کو ایک دن میں حافظے کا حصہ بنا لینا ان کے لیے چٹکیوں کا کھیل تھا، کسی کتاب کا طائرانہ مطالعہ بھی انھیں پندرہ بیس سال تک بقید صفحات محفوظ رہتا تھا، ان کے کانوں میں پڑی ہوئی کوئی بھی بات ان کی ذہن سے نہیں نکلتی تھی، اس لیے وہ علم وفن کی ان بلندیوں تک پہنچے۔ رہا ہمارا معاملہ، تو ہم کم زور ہیں۔ ہمارا حافظہ کم زور ہے۔ سیکڑوں دفعہ کتاب کی ورق گردانی بھی ہمارے لیے سودمند نہیں ہوتی۔ ہم علم کے ان مدارج کو کہاں طے کر سکتے ہیں جہاں ہمارے اسلاف کرام تھے۔

یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے کہ ہمارے پیش رو بزرگوں کی کام یابی اور علمی منزلیں طے کرنے کا ایک اہم سبب ان حضرات کا غیر معمولی حافظہ اور یادداشت کی قوت تھی؛ لیکن راقم سطور کی نظر میں اس رفعت و بلندی کی بنیادی وجہ ان حضرات کی محنت و جاں فشانی، جاں کاہی و دل سوزی، شب بیداری و آہ سحر گاہی اور علم وفن کی سچی محبت و تڑپ تھی۔ وہ علم کے ان بلند مناروں پر اپنی ذہانت و ذکاوت اور سرعت حفظ کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ جہد مسلسل، سعی پیہم اور حرکت و روانی کی بدولت پہنچے۔ وہ علم کے گوہر آب دار کی تحصیل میں راتوں رات جاگے، میلوں میل کا سفر پیدل طے کیا، کام و دہن کی لذت سے نہ صرف دور؛ بلکہ بھوک پیاس کی شدید مشقتیں جھیلیں، تجرد کی زندگی اختیار کی اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بھی اس کی مسرتوں اور پرلطف لمحوں سے کنارہ کش ہوکر محنت و مطالعہ کی خاموش فضا میں مسرور و مگن رہے، آرام وراحت کو یک سر تج دیا اور زندگی کی آخری ساعت تک علم کے شیدائی، اس کے جویا و متلاشی رہے۔ اس راہ میں انھوں نے ایسی ایسی قربانیاں پیش کیں، جنھیں سن کر آج بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انھوں نے پرتعیش زندگی پر پرمشقت راہوں کو ترجیح دی تب کہیں جاکر تاریخ عالم نے انھیں اپنے زریں صفحات میں جگہ دی۔

مؤرخ یوں جگہ دیتا نہیں تاریخ عالم میں
بڑی قربانیوں کے بعد پیدا نام ہوتا ہے

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ نے سچ فرمایا ہے:

”بے درد ہیں وہ لوگ جوان بزرگوں کی جاں کاہیوں کو نظر انداز کر کیان کے علمی کمالات کو محض اس زمانے

کے آثار کا ثمرہ بتا کر اپنے زعم باطل میں اپنے لیے ایک عذر تراشتے ہیں۔اگر ابونصر اور شیخ الرئیس کی سی جاں فشانی آج کے مسلمانوں میں پیدا ہوجائے تو ضرور ان کے برابر ہوسکتے ہیں"۔(علمائے سلف)

محنت و مشقت کامیابی کی شاہ کلید (Master Kay) کہلاتی ہے۔ایک انسان اپنی تن دہی و جاں فشانی کے ذریعے کام یابی کے ہر بند قفل کو کھول سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل سستی وکاہلی اور تن آسانی ہے، یہ آدمی کو گرچہ وہ عظیم بھی ہو، پست سے پست تر کرتی چلی جاتی ہے، اسی لیے معلم انسانیت جناب رسول ﷺ سستی وکاہلی سے پناہ مانگا کرتے تھے۔(صحیح مسلم: باب الدعوات والتعوذ)

ذیل کی سطروں میں اسلاف کی محنت و جاں فشانی، عزم وارادے، ان کی خاراشگافی وکوہ کنی اور شمع علم پر پروانہ وار نثار ہونے کے چند واقعات درج کیے جاتے ہیں؛ تاکہ ہم میں بھی علم کی ایک نہ بجھنے والی پیاس اور اس کی خاطر قربانیوں کا جذبۂ تاباں بیدار ہوسکے؛ کیوں کہ:

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت عقبہ بن عامر کے پاس ایک حدیث ہے جو مجھے معلوم نہیں، چنانچہ سفر کی تیاری شروع کردی، مصر جاکر حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حدیث سنی اور ایک لمحہ ٹھہرے بغیر مدینۃ النبی واپس ہوگئے۔(مسند احمد)

مشہور صحابی رسول حضرت جابر بن عبداللہ کا بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہے کہ انھوں نے صرف ایک حدیث کی خاطر مہینے بھر کا سفر کیا، شام جاکر عبداللہ بن انیس سے حدیث کی سماعت کی اور مدینہ روانہ ہوگئے۔(أسد الغابۃ)

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی دوگانہ ادا کی ہے۔ (مجموعۃ رسائل اللنوی)

ظاہر ہے کہ یہ شب بیداری علم وعبادت کے سوا کسی اور مقصد کے لیے نہ تھی۔

گم نام یعقوب جسے تاریخ اسلام نے پہلی مرتبہ " قاضی القضاۃ" کا معزز لقب دیا، اور علمی دنیا میں قاضی ابو یوسف کے نام سے جانے پہچانے اور پکارے گئے، بڑے کند ذہن تھے؛ لیکن محنت پیہم پابندی درس کی وجہ سے درس گاہ امام ابوحنیفہ کے سب سے باوقار، نمایاں اور فائق طالب علم شمار کیے گئے۔(تعلیم المتعلم:)

فقہ حنفی کے مدون امام محمدؒ جن کی رحلت نے ہارون جیسے بادشاہ کو بھی خون کے اشک رلایا تھا، ذہانت وذکاوت کے پیکر تھے، صرف ایک ہفتے میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا (فضائل حفاظ القرآن) لیکن اس کے باوجود محنت کا یہ عالم تھا کہ رات ورات سویا نہیں کرتے تھے۔کسی نے اس زحمت کشی کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا: كيف أنام وقد نامت عيون المسلمين تو كلاً علينا."(آداب المتعلمین:)

''میں کیسے سوجاؤں حالاں کہ مسلمانوں کی نگاہیں اس امید پر سوچکی ہیں کہ اگر کل کوئی مسئلہ پیش آئے گا تو امام محمد سے پوچھ لیں گے، اگر میں بھی سوجاؤں تو اس میں دین کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے"۔

حدیث کے مدون اول علامہ ابن شہاب زہریؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے بلا کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔محض اسّی دنوں میں حفظ کلام اللہ کی دولت سے سرفراز ہوگئے تھے۔آپ اپنے حافظے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: "میں "بقیع" سے

گزرتے وقت اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتا ہوں کہ کوئی فحش بات کانوں میں داخل نہ ہوجائے، واللہ میرے کانوں میں کوئی ایسی بات اب تک داخل نہیں ہوئی جسے میں بھول گیا ہوں"۔ اس ذہانت و ذکاوت کے باوجود کتابوں کی ورق گردانی اور مطالعہ کا ایسا چسکہ لگا تھا کہ گھر بار تک کی خبر نہ رہتی تھی، اپنی ساری علمی مسموعات سونے سے پہلے دہرالیا کرتے تھے۔ ان کی بیوی کہتی ہیں: "واللہ لہذہ الکتب أشد علی من ثلاث ضرائر ."

خدا کی قسم! یہ کتابیں میرے لیے تین سوکنوں سے زیادہ گراں ہیں۔(علمائے سلف)

یعنی اگر تین سوکنیں بھی ہوتیں تو شاید مجھے معیت کا اس سے کہیں زیادہ وقت مل جاتا، جتنا یہ مجھے ابھی دیتے ہیں۔

ممتاز مفسر علامہ ابن جریر طبریؒ نے علم کی خاطر تجرد کی زندگی اختیار کی۔(العلماء العزاب)اور اپنی زندگی میں تین لاکھ انسٹھ ہزار صفحات لکھے۔(وقت کا صحیح استعمال) آپ سے کسی نے پوچھا: آپ کا علمی خزانہ اتنا مالا مال کیسے ہوا؟ انھوں نے فرمایا: جان عزیز! تیس برس میری کمر نے بوریے کے سوا کسی اور بستر کا لطف نہیں اٹھایا۔(علمائے سلف)

شافعیت کے امام، مدرسہ نظامیہ کے بافیض مدرس، مہذب جیسی مقبول کتاب کے بااخلاص مصنف (جنہیں زبان رسالت مآب ﷺ نے "شیخ" کا لقب دیا تھا اور استاد محترم کتابوں میں مشغولی کی وجہ سے "حمامۃ المسجد" مسجد کا کبوتر کے نام سے پکارا کرتے تھے) شیخ ابواسحاق شیرازیؒ ذہانت و فطانت میں یکتائے روزگار تھے؛لیکن ان کا معمول کیا تھا،خود ان کی زبانی سنیے:" کنت أعید کل درس ألف مرة" میں ہر سبق کا ہزار بار اعادہ کیا کرتا تھا۔(العلماء العزاب)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اپنی یادداشت میں ضرب المثل تھے،کسی کتاب کا سرسری مطالعہ بھی انھیں بلفظہ محفوظ رہتا تھا، پر وہ اپنے شوق علم کے بارے میں کہتے ہیں:"ربما طالعت علی الآیۃ الواحدۃ نحو مأۃ تفسیر الخ" بسا اوقات ایک آیت کیلیے سوتفسیروں کا مطالعہ کرتے، پھر بھی گتھیاں نہ سلجھتیں تو شکستہ خاطر ہونے کے بجائے ویران مسجدوں کی خاک پر جبین نیاز خم کرتے ہوئے دعا گو ہوتے: اے آدم وابراہیم(علیہما السلام) کے معلم! مجھے سمجھ عطا فرما! ایک مرتبہ شدید بیمار ہوئے،طبیب نے مطالعے سے منع کردیا، لیکن باز نہیں آئے اور فرمایا: میری طبیعت علم ومطالعے میں فرحت محسوس کرتی ہے۔(قیمۃ الزمن عند العلماء،متاع وقت اور کاروان علم)

حنبلیت کے رئیس، شیریں دہن خطیب، مقبول ترین واعظ اور عظیم مصنف(جن کے آخری غسل کا پانی گرم کرنے کیلیے وہ برادہ نہ صرف کافی ہوگیا تھا؛ بلکہ بچ بھی گیا تھا جو حدیث لکھنے کے لیے قلم بنانے میں جمع ہوگیا تھا)علامہ ابن الجوزیؒ ایام طالب علمی میں "نہر عیسیٰ" کے پانی میں روٹیاں بھگو کر کھایا کرتے تھے اور اسی عالم میں بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ (مقدمۃ غریب الحدیث،متاع وقت اور کاروان علم،مقدمۃ صفۃ الصفوۃ)

أصح الکتب بعد کتاب اللہ الباری کے مصنف ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ کے حافظے کا ایک عالم میں شہرہ ہے۔آپ سے محمد بن حاتم نے جو خود بھی سعی وکاوش میں بے مثال تھے، حافظے کی دوا پوچھی تو امام بخاریؒ نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں۔ پھر فرمایا:"لا أعلم شیئا أنفع للحفظ من نهمة الرجل و مداومة النظر ."حافظے کے لیے سب سے زیادہ سودمند اور نفع بخش چیز آدمی کا شوق وذوق اور کتب

بینی و مطالعہ ہے۔ اسی شوق نے امام بخاری کو بیسیوں سال سالن کھانے کا موقع نہیں دیا، بادام کے صرف چند دانوں پر اکتفا کرتے پر جہد مسلسل اور سعی پیہم کا یہ عالم تھا کہ رات کو بیسیوں دفعہ اٹھتے، چراغ جلاتے، علمی فوائد نوٹ کرتے اور پھر لیٹ جاتے۔ (مقدمۃ فتح الباری)

یقیناً:

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خان فرہاد

فن رجال کے متفق امام، حدیث کے بے مثال محدث، جنت البقیع میں آسودۂ خواب یحی بن معینؒ کے اسم گرامی سے فن حدیث کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی واقف ہے۔ علم کی راہ میں آپ کی جد و جہد کی یہ حالت تھی کہ آپ خود فرماتے ہیں: "میں نے اپنے ہاتھ سے دس لاکھ احادیث لکھیں اور جب تک ایک حدیث پچاس مرتبہ نہیں لکھ لیتا، مجھے اطمینان نہیں ہوتا تھا"۔ (سیر أعلام النبلاء)

آہ!!

گنواں دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

ان محسنین امت نے عام حالات میں جو قربانیاں پیش کیں، وہ تو اپنی مثال آپ ہے ہی، تادم واپسیں بستر مرگ پر بھی جب کہ انسان اپنی ذات کو بھی فراموش کر جاتا ہے، یہ حضرات علمی افادہ واستفادہ ہی میں مصروف رہے اور اسی مشغلے میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کیں۔ قاضی ابو یوسفؒ رحلت کے وقت "رمی جمار" کے مسائل سمجھا رہے تھے۔ امام محمدؒ "مکاتب" کے مسئلے میں مشغول تھے۔ علامہ ابن جریر طبریؒ ایک دعا لکھنے کے لیے دوات وقلم منگوا رہے تھے اور صاحب الفیہ ابن مالکؒ اشعار یاد کر رہے تھے۔ (قیمۃ الزمن عند العلماء، ظفر المحصلین)

اسلامی تاریخ کا عظیم سیاح اور ریاضی داں البیرونی بھی جاں کنی کے وقت علی بن عیسیٰ سے ایک فقہی مسئلہ دریافت کر رہا تھا، علی نے تعجب سے پوچھا کہ تکلیف کی اس شدت میں بھی بتاؤں؟ البیرونی نے ایک ایسا جواب دیا جو علم کا ایک سچا عاشق ہی دے سکتا ہے۔ فرمایا:

"أودع الدنيا و أنا عالم بهذه المسئلة ألا يكون خيرا من أن أخليها و أنا جاهل بها."

بھائی! دنیا سے اس مسئلے کا علم لے کر رخصت ہونا جاہل مرنے سے بہتر ہے۔ (معجم الادباء)

رحمهم اللّٰه رحمةً واسعةً .
أولئك آبائي فجئني بمثلهم
إذا جمعتنا يا جرير المجامع

☆☆☆

❑ تشخیص وعلاج (قسط-۱)

امت مسلمہ کے مہلک امراض

محمد سہیل ندوی
(استاد: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ)

قرآن کریم میں اس امت کو خیر امت کہا گیا ہے اور متعدد خصوصیات و امتیازات کی بنیاد پر اس امت کو فوقیت وفضیلت کا شرف بخشا گیا ہے، یہ اعزاز وشرف اس امت کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک یہ امت اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو انجام دیتی رہے گی، اس امت کو برپا کرنے کا مقصد ہی امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے، یہی اس کا مقصد تخلیق ہے، بھلائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا اس کی صفت لازمہ ہے، یہ امت جب اپنے اس کام کو چھوڑ دے گی تو پھر اس اعزاز کی مستحق نہیں رہے گی، بلکہ پھر تباہی و بربادی اس کا مقدر ہوگی اور ہلاکت کی گہری کھائیوں میں جا گرے گی۔ یہ اس کی فضیلت ہی کی تو بات ہے کہ اللہ نے اس کے مقابلہ میں تمام ادیان و مذاہب کو قیامت تک کے لئے منسوخ قرار دے دیا، سورہ آل عمران میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے "انّ الدّین عند اللّٰہ الاسلام" اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، دین اسلام کی جگہ کوئی اور مذہب اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہے، جو شخص دین اسلام کے علاوہ کوئی اور مذہب تلاش کرے گا اللہ اس کو ہرگز قبول نہیں فرمائے گا، کیونکہ اس امت کے برپا ہوجانے کے بعد ساری شریعتیں منسوخ کردی گئیں اور دین اسلام کا ان سب کو پابند بنادیا گیا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "اگر موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری شریعت کی اتباع کرتے"، لہٰذا اس دین کے پیروکاروں و متبعین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس دین کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انجام دیں، ہر قسم کے تغیر وتبدیلی سے اس کو محفوظ رکھیں، اس امت کی کامیابی اور شاہ کلید اسی میں مضمر ہے۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج اس امت کے لوگ اپنی تمام تر خصوصیات و امتیازات کے باوجود ایک عام امت کی طرح زندگی گزار رہے ہیں، اپنی ذمہ داریوں اور مقام و مرتبہ کا احساس نہیں ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ امت دوسروں کو راستہ دکھاتی اور ان کے لئے آئیڈیل ونمونہ ثابت ہوتی لیکن یہی امت آج بتدریج زوال کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے، یہ سنّت اللہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے مشن اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے تو پھر ذلت ورسوائی اور زوال اس امت کا مقدر بنتا ہے، بالکل یہی حال اس امت کا ہورہا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ امت در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امت کے افراد کو ان کے مقام ومرتبہ سے واقف کرایا جائے، ان کی احساس کمتری کو دور کیا جائے، اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ امت ہر اعتبار سے فائق و برتر ہے، اور ان میں جو کمیاں اور کوتاہیاں در آئیں ہیں ان کے ازالہ کی کوشش کی جائے۔

عالم عرب کے مشہور عالم واسلامی مفکر ڈاکٹر راغب سرجانی اپنی کتاب "قصة التتار من البداية الىٰ عين جالوت" میں مسلمانوں کے اسباب زوال پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے کچھ امراض کی نشاندہی فرمارہے ہیں، ذیل میں ہم ان نکات کی تلخیص پیش کررہے ہیں، ان کو قسط وار تین قسطوں میں شائع کیا جائے گا۔

(۱) اسلامی شناخت کا فقدان

اللہ تبارک وتعالیٰ کا اصول اور ضابطہ ہے کہ جب تک یہ امت اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتی رہے گی اس کے حق میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیصلے ہوتے رہیں گے، ارشاد ربّانی ہے "إن تنصروا اللّٰه ينصركم و يثبّت أقدامكم" اگر تم اللہ کی مدد کروگے (یعنی اس کے دین کی نصرت کروگے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدم جمادے گا)۔ اسلام ایک جھنڈے کے نیچے سب کو جمع کرتا ہے، تمام انسانوں کو اتحاد واتفاق کے ساتھ رہنے کی تعلیم دیتا ہے، قومی، لسانی، طبقاتی، نسلی بنیاد پر کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتا، یہ اس امت کی سب سے بڑی غلطی اور مہلک بیماری ہے جو اس کو دیمک کے مانند کھاتی چلی جارہی ہے، جب جب یہ امت اتحاد واتفاق کو پارہ پارہ کرے گی اور بجائے شیر وشکر ہونے کے کسی بھی قسم کی تفریق پیدا کرے گی تو شکست و ہزیمت اور ذلت ورسوائی اس کا مقدر بنے گی، اس امت کے ظاہر وباطن کی یکسانیت پر اللہ کی نصرت اور مدد کے وعدے اور فیصلے ہیں، ہمارا ظاہر وباطن، ہماری سیاست ومعیشت، ہمارے قضاء وفیصلے، ہماری ترجیحات جب تک عین اسلامی تعلیمات کے تابع نہیں ہوں گی اللہ کی نصرت نہیں اتر سکتی، پورے اعتماد و یقین کے ساتھ اسلام کا ہر حکم عزیز ہونا چاہئے، مکمل اسلامی تشخص و شناخت کے ساتھ رہنے کا ہر مسلمان کا عزم ہونا چاہئے، اس امت کی پہچان باہمی اتحاد واتفاق ہے، اس امت کے بقاء اور تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ تمام قسم کے بھید بھاؤ، امتیازات اور آپسی اختلافات کو پیروں تلے روند دیا جائے، اور مل جل کر رہنے کی ترغیب دی جائے، اللہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے "ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم واصبروا، انّ اللّٰه مع الصّابرين" (سورہ انفال، ٤٦) اے ایمان والو! آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ پسپا ہوجاؤگے، (اور ناکام ہوجاؤگے) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو، (یعنی مضبوطی سے مقابلہ میں ڈٹے رہو) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(۲) دنیاوی لطف ولذت اور اس کی طرف بڑھتا ہوا میلان

یہ دنیا فانی ہے، اس کو بقاء ودوام نہیں ہے، اس کو ہر حال میں فنا ہونا ہے، یہاں کی کسی چیز کو دوام واستقرار نہیں ہے، آخرت باقی رہنے والی چیز ہے، اس کا سلسلہ لامتناہی ہے، دراصل آخرت کی تیاری ہی کے لئے اس مادی دنیا کو وجود بخشا گیا ہے، کسی مسلمان کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ اس کی زندگی کا مقصد صرف دنیا کمانا اور اس کو حاصل کرنا ہو، آج صورت حال اس کے برعکس ہے، دور حاضر کا سب سے تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا مرض فکر دنیا اور اس کی آرائش وآسائش کا حصول ہے، آخرت کی غفلت کے ساتھ ہر انسان اس بات کی کوشش اور ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہے کہ اس کا معیار زندگی بلند کس طرح ہو، انواع واقسام کے کھانے، اچھے اور قیمتی ملبوسات، عالیشان محلات اور معیاری وقیمتی سواریاں اس کو کس طرح میسر ہوں، مزید برآں مترنم آوازوں کی طرف میلان اور نت نئے میوزک کا شوق آخرت کی فکر اور با مقصد زندگی گزارنے میں مانع آرہا ہے، اس امت کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ڈرامائی گانوں اور مترنم اشعار میں تو دلچسپی لیتی ہے لیکن قرآن کریم کی بنیادی سورتوں سے ناآشنا اور ناواقف ہے، فلمی اداکاراؤں اور فن کاروں کی اسٹوری اور تاریخ تو یاد رکھتی ہے

لیکن اپنی امت کے آئیڈیل علماء ورہنماؤں سے ناواقف رہتی ہے، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہوں تو اصحاب رسول کے بارے میں کچھ معلومات نہیں رکھتی بلکہ اللہ کے رسول ﷺ تک سے اس کو کوئی دلچسپی اور عقیدت نہیں ہے، کیا یہ مرض اور بے اعتنائی اس امت کی تباہی و بربادی کے لئے کافی نہیں ہے؟ آخرت سے بے پرواہ ہوکر عیش پسندی اور عیاشی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، ارشاد ربّانی ہے "وإذا أردْنا أن نّهلك قريةً أمرْنا مُتْرفيها ففسقوا فيها فحقّ عليها القول فدمّرْنا ها تدْميراً" (سوره اسراء، ١٦)

(اور جب ہم کسی علاقہ کو (وہاں کے لوگوں کی بد عملیوں کی بنا پر) تباہ کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوشحالوں اور عیاشوں کو (صحیح راستہ پر آنے کا) حکم دیتے ہیں، اور وہ نافرمانیوں پر تلے رہتے ہیں، تو فیصلۂ عذاب نافذ ہوتا ہے، اور ہم اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے ہیں)

تن آسانی اور عیش پسندی اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ فقیر وقلاّش، محتاج ومفلس بھی اس سے بچا ہوا نہیں ہے، وہ مفلس وقلاّش جو دو پہر کو کھا کر شام کا انتظار نہ کرتا ہو، آج کا کھا کر کل کا انتظام جس کی وسعت وقدرت سے باہر ہو وہ بھی اس قدر تنگی ومفلسی کے باوجود اپنی سگریٹ اور منشیات کا انتظام کر لیتا ہے، جو اپنے اور اپنے بچوں کا تن ڈھانپنے اور سر چھپانے کی حالت میں نہ ہو وہ بھی چائے خانوں اور ڈھابوں میں یوں ہی فضول بکواس میں گھنٹوں گزار دیتا ہے، اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا جس کی استطاعت سے باہر ہو وہ بھی ویڈیوز کا شوقین اور چینلز کو سبسکرائب کرنے کی اہلیت کا کہیں نہ کہیں سے انتظام کر لیتا ہے، غربت ومفلسی کے باوجود جس قوم کی عیاشی وبے مقصدیت کا یہ حال ہو اس قوم کو تباہ و برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا، یہ اس امت کا سب سے بڑا روگ اور مرض ہے، فضولیات سے اجتناب کرنا اور اپنے مقصد تخلیق کو مدنظر رکھنا ہی کامیابی کا زینہ ہے۔

(۳) جہاد کی اہمیت کو ترک کر دینا

دنیا کی مادی وفانی چیزوں میں مستغرق ہوکر جہاد کی اہمیت اور اس کی حقیقت دل ودماغ سے محو ہوجاتی ہے، جب جہاد کی اہمیت دلوں سے نکل جاتی ہے تو پھر زمام اقتدار سنبھالنے اور قیادت کرنے کے بجائے دیگر قوموں کے ساتھ طفیلی بن کر رہنا پڑتا ہے، جہاد امن وامان کے قیام اور فساد کو ختم کرنے کا ذریعہ ہے، ظالم کو ظلم سے روکنے اور مظلوم کو اس کا حق دلانے کا نام ہے، مسلمانوں کے بنیادی حقوق جن کو ان سے محروم کر دیا گیا ان کو واپس لانے کا واحد حل اور علاج ہے، جہاں مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو، عفت وعصمت محفوظ نہ ہو، ان کے وجود محفوظ نہ ہوں، ان کی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی مکمل آزادی نہ ہو، ان کے دینی معاہد ومراکز محفوظ نہ ہوں، ان کے مقام ومرتبہ اور تشخص پر حرف آرہا ہو، وہاں اس کو اختیار کرنا لازم اور ضروری ہے، لفظ جہاد کوئی معیوب لفظ نہیں ہے، جس طرح آج کے اس دور میں اس سے اجتناب کیا جاتا ہے اور اس کو مخفی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، نصاب تعلیم سے جہاد اور اس سے متعلق احکامات کو جس طرح مٹایا جارہا ہے اور کھل کر اس کے متعلق کوئی بات کہنے یا اس کی ضرورت واہمیت سے انکار کیا جارہا ہے یا نرم پہلو اختیار کیا جارہا ہے تو یہ عمل درست نہیں ہے، جہاد اسلام کی چوٹی ہے، اسلامی تعلیمات میں جہاد کو بنیادی اور مرکزی مقام حاصل ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کے تعلق سے لچک دار موقف رکھنے کی گنجائش ہے۔

جہاد اور اس کے مشتقات قرآن کریم میں تیس سے زائد مرتبہ وارد ہوئے ہیں، اسی طرح قتال (جنگ) کا جہاں جہاں تذکرہ ہے وہاں خاص پس منظر اور امت کے دشمنوں کے ساتھ قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

ارشادربانی ہے"یا ایّھا النّبیّ حرّض المؤمنین علی القتال"(سورہ توبہ، ٦٥) اے نبی! ایمان والوں کو جنگ پر ابھاریئے، (ان کو کفر سے جنگ کے لئے تیار کیجئے)

دوسری جگہ ارشادفرمایا گیا"یا ایّھا الّذین آمنوا قاتلوا الّذین یلونکم مّن الکفّار ولیجدوا فیکم غلظة، واعلموا أنّ اللّٰہ مع المتّقین"(سورہ توبة، ۱۲۳) اے ایمان والو! جوکافرتمہارے آس پاس کے علاقوں میں ہیں (اورفتنوں میں ملوث ہیں) ان سے جنگ کرو، اور وہ تمہارا سخت موقف محسوس کریں، اور جان لوکہ اللہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے ساتھ ہے)

ایک جگہ فرمایا گیا"وقاتلوا المشرکین کافّةً کما یقاتلونکم کافّةً"(سورہ توبہ،٣٦) اورمشرکوں سے مکمل طور پر جنگ کرو، جیسے وہ تم سے جنگ کرتے ہیں، اور جان لوکہ اللہ اپنے نظام کالحاظ رکھنے والوں کے ساتھ ہے)

جوقوم اپنی عزت وآبرو کی حفاظت چاہتی ہو اور اپنے اوپر سے ظالمانہ مظالم دور کرنا چاہتی ہو وہ جہاد کا کیونکر انکار کرسکتی ہے، یعنی عزت وآبرو، جان و مال، اور اسلامی تعلیمات وتشخص کی حفاظت کا ذریعہ جہاد ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اہمیت کو کم کرنا اور اس کے متعلق کھل کر نہ بولنا بھی ایک مرض ہے جس کے رہتے ہوئے کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی، اسلام کی پوری تاریخ ہمارے لئے عبرت کا سامان ہے۔

۴۔دشمنان اسلام سے دوستیاں

کفر وایمان کبھی ایک جگہ جمع نہیں سکتے جس طرح تاریکی اور روشنی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی، ایمان اپنی روحانی طاقت وقوت کے ساتھ جہاں جلوہ افروز ہوتا ہے، وہاں باطل طاقتیں لرزہ براندام ہوجاتی ہیں، طاغوتی طاقتوں میں رعشہ طاری ہوتا ہے،ضلالت و گمراہی کا خاتمہ ہوتا ہے، عدل و انصاف کا بول بالا ہوتا ہے، احقاق حق و ابطال باطل کا نظارہ ہوتا ہے، اہل ایمان کا جہاں غلبہ ہوتا ہے وہاں امن وسکون، عدل وانصاف پرمبنی نظام کا نفاذ ہوتا ہے، ظالموں کو اپنے لئے زمین وسعت کے باوجود تنگ نظرآنے لگتی ہے، لیکن جب ایمان میں ہی کمزوری اوراضمحلال آجائے، دینی وایمانی غیرت کا جنازہ نکل جائے، اخلاص کا فقدان ہو، مادیت کا غلبہ ہو، آخرت کے انجام سے غفلت ہو، اور مادیت کا اتنا غلبہ ہو کہ کافروں ومشرکوں سے دوستیاں رچائی جانی لگیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمانی طاقت سے رشتہ کمزور کمزور پڑچکا ہے، کفار و مشرکین سے دوستیاں رچانا اوران کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھنا، ان کی باتوں پر اعتماد کرنا یا ان کی باتوں کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا اوران سے عہد و پیمان کرنا صریح اسلامی تعلیمات و ہدایات کی خلاف ورزی ہے، اسلام کبھی اس کی اجازت نہیں دیتا، ارشاد باری تعالیٰ ہے " یا أیّھا الّذین آمنوا لا تتّخذوا الیھود والنّصٰری أولیاء، بعضھم أولیاء بعض ، ومن یّتولّھم مّنکم فإنّہ منھم، انّ اللّٰہ لا یھدی القوم الظّالمین" (اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا قابل اعتماد ساتھی اور دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے سے اصل تعلق رکھتے ہیں، تم میں سے جوان سے (اپنے دین وعقیدہ کے خلاف) تعلق رکھے گا وہ انہیں میں شمار کیا جائے گا، اللہ ایسے غلط کاروں کو ہدایت نہیں دیتا) یہ اللہ ربّ العالمین کی طرف سے وارننگ اورالارم ہے، کون ایسا بے غیرت و بے حمیت ہوگا جو ان صریح ہدایات کو سنے اور ان پر کان نہ دھرے۔

(..........جاری)

☆☆☆

□ مطالعۂ کتب

کتاب التجرید لابی الحسن القدوری-ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(استاد: مدرسہ معینیہ عظمت العلوم، مظفر پور، بہار)

کتاب التجرید چوں کہ علم الخلاف یا فقہ مقارَن سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے تعارف سے پہلے فقہ مقارَن کے بارے میں چند ضروری باتیں ذکر کردی جائیں۔

فقہ کے لغوی معنی

لغت میں فقہ کے معنی: فہم اور سمجھ بوجھ کے آتے ہیں۔ اسی مفہوم میں قرآن کی یہ آیت: وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِی یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِی ۡ. (طٰہٰ:۲۷) اور حدیث شریف: من یرد اللّٰه به خیراً، یفقّهه فی الدین. ہے۔

فقہ کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح شرع میں فقہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

" هو العلم بالأحكام الشرعية العملية المكتسب من أدلتها التفصيلية ."(یعنی تفصیلی دلائل سے شریعت کے عملی احکام کو جاننے کا نام فقہ ہے)۔

مقارَن کی لغوی تعریف

لغت میں مقارَنۃ کے معنی آتے ہیں: الجمع والوصل۔ یعنی جمع کرنا، ملانا۔

فقہ مقارَن کی اصطلاحی تعریف

"هو دراسة الآراء الفقهية المختلفة فی المسألة الواحدة مع مستنداتها من الأدلة الشرعية، وتقويمها، وبيان مالها وما عليها بالمناقشة، وإقامة الموازنة بينها، توصلاً إلى معرفة الراجح منها، أو الجمع بينهما، أوالإتيان برأيٍ جديدٍ أرجحَ دليلاً منهاء، وبذلك تتحق نقاط الاتفاق بين الآراء والمذاهب، وتحدد نقاط الاختلاف، ويكشف عما هو خلاف صورى أو شكلى أو اصطلاحى، وما هو اختلاف واقعى، مع بيان الأسس والأصول والقواعد التى انبنى عليه كل قول، وتكون سببًا للخلاف بين الآراء، ويرجع إليها الاختلاف فى الأ قوال والمذاهب ."

(یعنی فقہ مقارن نام ہے کسی ایک مسئلے میں فقہی آرا کا ان کے شرعی دلائل کے ساتھ مطالعہ کرنے، ان کی جانچ پرکھ کرنے، ان کے محاسن ومعائب پر گفتگو کرنے اور ان کے درمیان اس مقصد سے موازنہ کرنے کا کہ قول راجح کی جان کاری ہو سکے، یا ان تمام آرا کو معمول بہا بنایا جا سکے، یا ان سے زیادہ قوی رائے سامنے لائی جا سکے۔ اس طرح آرا ومسالک کے اتفاقی نقطے معلوم ہوجاتے ہیں اور اختلاف کی جہتیں بھی واضح ہوجاتی ہیں، اور جو جزوی یا ذیلی یا اصطلاحی اختلاف ہے وہ اصلی اختلاف سے ممیّز بھی ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اصول وقواعد کی وضاحت کرنا بھی فقہ مقارن کا حصہ ہے جن پر

ہر قول کی بنیاد پڑی ہے، اور جن کی وجہ سے آرا کا اختلاف سامنے آیا ہے)۔

تعریف کا خلاصہ

۱۔ کسی متعین مسئلے میں فقہا کے اقوال اور ان کی فقہی آرا کو جمع کرنا۔

۲۔ ان میں سے ہر ایک رائے کا دوسری آرا کے ساتھ موازنہ کرنا۔

۳۔ بغیر کسی مذہبی اور مسلکی تعصب کے تحلیل و تجزیہ کر کے دلائل کی بنیاد پر ان میں سے زیادہ راجح رائے کو ترجیح دینا۔

گویا فقہی مسائل میں مختلف مسالک و مکاتب فکر کی آرا کو جمع کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کرنا 'فقہ مقارن' کہلاتا ہے۔

فقہ مقارن، فقہ اسلامی کا نہایت اہم پہلو ہے۔ اس کو ابتدائی دور میں "علم الخلاف" کہا جاتا تھا، جس میں شرعی دلائل بیان کرنے، دلائل پر وارد ہونے والے شبہات اور فریق مخالف کے دلائل کا قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ جواب دینے کے طریقوں سے بحث کی جاتی تھی۔

لیکن جب صنعتی انقلاب کے نتیجے میں زندگی کے ہر میدان میں نئے نئے مسائل سامنے آئے، اور تیز رفتار ٹکنالوجی کی ترقی نے انسانی طرز زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا، تو ایسے میں فقہ اسلامی کو بھی کئی مسائل اور چیلینجز کا سامنا کرنا پڑا، اور ایک ہی مسلک کے دائرے میں رہ کر ان کے حل میں دشواری پیش آنے لگی۔ اس کے نتیجے میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ تمام فقہی مسالک کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور اپنے مسلک پر باقی رہتے ہوئے دوسرے فقہی مسالک سے استفادہ کر کے جو رائے دلائل کی روشنی میں راجح معلوم ہو، اس کے مطابق مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ فقہی مسالک کے اسی تقابلی مطالعے کو دور حاضر میں "فقہ مقارن" یا "فقہ تطبیقی" کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا۔

عصر حاضر میں فقہ اسلامی کے مختلف مسالک اور مکاتب فکر کے تقابلی مطالعہ کا رجحان اہل علم کے حلقوں میں کافی بڑھ گیا ہے۔ مختلف حلقوں اور اداروں سے یہ صدا لگائی جارہی ہے کہ زمانے کا تقاضا ہے کہ فقہ اسلامی کے مختلف ابواب میں فقہا کے بنیادی اختلافات سے آگاہی حاصل کی جائے، اور عصر حاضر کے پیدا کردہ نت نئے مسائل میں کسی خاص مکتب فکر کی بجائے فقہ اسلامی کے چاروں مکاتب کو سامنے رکھ کر ان مسائل کا آسان اور اقرب الی الصواب حل نکالنے کی کوشش کی جائے۔

فقہ مقارن پر لکھی گئی چند اہم کتابیں

فقہ مقارن پر علما نے ہر دور میں اہم اور جامع کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ متقدمین کی کتابوں میں قاضی عبدالوہاب مالکی بغدادی کی کتاب "الإشراف علی نکت مسائل الخلاف"، علامہ دبوسی کی "تاسیس النظر فی اختلاف الائمۃ"، ابن ہبیرہ کی "الافصاح عن معانی الصحاح"، ماوردی کی "الحاوی الکبیر"، ابن حزم اندلسی کی "المحلی"، ابن رشد مالکی کی "بدایۃ المجتہد"، امام بیہقی کی "الخلافیات"، علامہ کاسانی کی "بدائع الصنائع"، ابن قدامہ حنبلی کی "المغنی" اور امام قدوری کی "کتاب التجرید" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دور حاضر میں بھی اس موضوع پر قابل قدر کوششیں ہوئی ہیں اور بہت سی مفید تصنیفات منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور اہم کتاب ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی "الفقہ الاسلامی وأدلتہ" ہے، جس میں مصنف نے فقہ کے تمام ابواب میں مذاہب اربعہ اور ان کے دلائل کے بیان کا اہتمام کیا ہے۔ ائمہ کی آرا کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے اپنی رائے اور موقف کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فقہ مقارن پر ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب موسوعی اور منفرد انداز کی کتاب ہے۔ معروف مصری عالم شیخ عبدالرحمٰن جزیریؒ کی

کتاب "الفقہ علی المذاہب الأربعۃ" بھی فقہ اسلامی کے تقابلی مطالعے کے لیےا یک اہم کتاب ہے۔ ڈاکٹر محمود ابواللیل اور ڈاکٹر ماجد ابورخیہ کی مشترکہ کاوش کے نتیجے میں فقہ مقارن پر ایک عمدہ اوروقیع کتاب "بحوث فی الفقہ المقارن" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ڈاکٹر محمد فتحی درینی کی کتاب "بحوث مقارنۃ فی الفقہ الإسلامی وأصولہ" بھی فقہ مقارن پر ایک شاندار کتاب ہے۔ اردو میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی "قاموس الفقہ" فقہ مقارن میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔اسی طرح کویت سے شائع ہونے والے عظیم موسوعہ "الموسوعۃ الفقہیۃ" میں بھی تمام مسالک کے بیان کا التزام کیا گیا ہے۔

اصول فقہ کے تقابلی مطالعے کے حوالے سے سب سے مفصل تصنیف جامعہ امام محمد بن سعود کے معروف پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم النملہ کی کتاب "المہذب فی أصول الفقہ المقارن" ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی کتاب "أصول الفقہ الإسلامی" میں چاروں مذاہب کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔اردو میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اصول فقہ-ایک تعارف" اصول فقہ کے تقابلی مطالعے کے حوالے سے مفید کتاب ہے۔

متقدمین کی کتابوں میں امام قدوری کی کتاب التجرید کوفقہ مقارن میں بڑاامتیاز حاصل ہے۔اس مقالے میں اسی کتاب کا تعارف کرانا مقصود ہے؛مگر اس سے پہلے مصنف کتاب کامختصر تعارف ضروری ہے۔

امام قدوریؒ- مختصر تعارف

چوتھی صدی ہجری میں جن عظیم شخصیات نے جنم لیا ان میں امام قدوری کا نام جلی عنوان سے لکھا جاتا ہے۔آپ کا پورانام: ابوالحسین،احمد بن محمد بن جعفر بغدادی،قدوری ہے۔سنہ۳۶۲ھ/ ۹۷۳ء کو آپ بغداد کی زرخیز اور علم ریز سرزمین میں پیدا ہوئے،اور۴۲۸ھ/۱۰۳۷ءکو۶۶/ برس کی عمر میں چشم عالم سے نہاں ہو گئے۔

آپ نے علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔آپ کے والد ماجد وقت کے عالم جلیل اورمحدث کبیر تھے۔اس وقت بغداد کی سرزمین علم سے مالامال اورعلما سے نہال تھی۔ہر طرف علمی چرچے اور ہرسو علمی حلقے تھے۔ایسے ماحول میں آپ پلے بڑھے اور درجہ بہ درجہ علمی منازل طے کرتے رہے۔اللہ نے ذہن کی زرخیزی اور حافظے کی قوت سے نوازا تھا،جس کے نتیجے میں آپ نے بہت جلدوہ مقام حاصل کرلیا جوکم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

علمی مقام

آپ کو یوں تو علم کی بیشتر شاخوں میں دسترس حاصل تھی؛مگر "فقہ وتفقہ" کی دولت سے خاص طور پر آپ مالامال تھے،جس کا اعتراف آپ کے معاصرین نے بھی کیا ہے۔آپ کا شمار فقہائے احناف کے پانچویں طبقے یعنی اصحاب الترجیح میں ہوتا ہے۔خطیب بغدادی نے آپ کے فقہی مقام اور علمائے احناف کے درمیان آپ کے علومرتبت کے بارے میں لکھا ہے:

"كان ممن أنجب في الفقه لذكائه،و انتهت إليه بالعراق رئاسة أصحاب أبي حنيفة،وعظم عندهم قدره وارتفع جاهه ."

آپ کے علمی مقام اورعظمت شان کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے شاگردوں میں خطیب بغدادی جیسے حافظ حدیث اورناقد ومؤرخ شامل ہیں۔

چنداہم تصنیفات

آپ کے قلم سے کئی اہم اورقیمتی کتابیں نکلیں،جن کی وجہ سے علمائے احناف میں آپ کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ان میں التقریب،شرح الختصر،المختصر(قدوری) اور

التجرید خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

کتاب التجرید-ایک تعارف

امام قدوری کی یہ کتاب " علم الخلاف " سے تعلق رکھتی ہے، جس میں انھوں نے احناف اور شوافع کے درمیان پائے جانے والے مختلف فیہ مسائل کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا ہے۔ دونوں مسالک کے مسائل اور دلائل پیش کرنے کے بعد مسلک احناف کی ترجیح ثابت کی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کا املا ۳۲/ ذی قعدہ سنہ ۵۰۴ھ کو شروع کرایا تھا، جو کتاب الطہارۃ سے شروع ہوکر کتاب ادب القاضی پر ختم ہوا۔ کتاب شروع میں صرف ایک ضخیم جلد میں تھی۔ پھر یہ سات جلدوں میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۲۰۰۴ء میں دارالسلام، قاہرہ سے اس کا ایک محقق ایڈیشن شائع ہوا ہے جو ۲۱/ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور یہی میرے پیش نظر ہے۔ کتاب کے مواد و مباحث کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ علم الخلاف اور فقہ مقارن کے موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے؛ مگر افسوس کہ علمی حلقوں میں اسے وہ مقام حاصل نہیں ہے، جو اسے ملنا چاہیے۔

کتاب کی اہمیت

کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے محقق کتاب لکھتے ہیں:

۱۔ یہ پہلی فقہی کتاب ہے جس میں فقہ مقارن کے خدوخال کو اچھی طرح نمایاں کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ کتاب فقہی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں احناف کے دلائل کو جمع کیا گیا ہے اور ان کی بھرپور وکالت کی گئی ہے۔ شوافع کے دلائل کے استقصا کے لحاظ سے بھی یہ کتاب موسوعہ کا درجہ رکھتی ہے۔

۳۔ کتاب میں احناف اور شوافع کے فقہی نصوص کا اس قدر وافر حصہ اس میں جمع ہوگیا ہے کہ آج تک کسی کتاب میں اس قدر احاطہ نظر نہیں آتا۔

۴۔ اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ مختلف فقہی مسالک کے مابین علمی مناقشہ کا اسلوب اور لب ولہجہ کیسا ہونا چاہیے، تو اس کے لیے یہ کتاب بہترین نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ امام قدوری نے اس کتاب میں امام شافعی اور ان کے اصحاب کے موقف کا رد کرتے ہوئے جس قدر نرم لہجہ اور عمدہ اسلوب اختیار کیا ہے، وہ قابل تقلید ہے۔

۵۔ امام قدوری نے مسلک احناف پر وارد کیے جانے والے معترضین کے اس اعتراض کہ یہ ایسا مسلک ہے جس میں رائے کو فوقیت؛ بلکہ اس کو سنت پر ترجیح دی جاتی ہے کا اس طرح پرزہ اڑایا ہے کہ قاری کو یقین اور اطمینان ہوجاتا ہے کہ تمام فقہا کی طرح احناف بھی قرآن وسنت ہی کو مقدم رکھتے ہیں اور ان دونوں ہی کو بنیادی مصدر کی حیثیت دیتے ہیں۔

کتاب کا منہج، اسلوب اور خصوصیات

امام قدوریؒ نے اس کتاب میں جو منہج اختیار کیا ہے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ احناف اور شوافع کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ بیان کرنے کے بعد دونوں مسلکوں کے دلائل تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ پھر دلائل کی روشنی میں مسلک احناف کو راجح قرار دیا ہے۔

۲۔ ہر مسئلے میں مسلک احناف کو پہلے بیان کیا ہے۔ احناف میں اگر امام ابوحنیفہؒ کا قول ذکر کرنا ہو، تو اس کے لیے (قال أبوحنیفۃ) کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ اور اگر صاحبین کا قول ذکر کرتے ہیں، تو (قال أبو یوسف ومحمد) کی تعبیر اختیار فرماتے ہیں؛ لیکن اگر کسی کی طرف قول منسوب کیے بغیر صرف مسلک کو بیان کرتے ہیں، تو اس کے لیے (قال أصحابنا) کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ احناف کا مسلک ذکر کرنے کے بعد شوافع کا مسلک بیان کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہی منہج اختیار کرتے ہیں

جو مسلک حنفی کے بیان میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی اگر امام شافعیؒ کا قول ہو تو اس کے لیے (قال الشافعی) اور اگر کسی کی طرف منسوب کیے بغیر صرف مسلک بیان کرنا مقصود ہو، تو اس کے لیے (قال أصحاب الشافعی) کی تعبیر اختیار فرماتے ہیں۔

۴۔ کتاب میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ پہلے احناف کے مستدل کو بیان کیا گیا ہے، اور اس کے لیے (لنا) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس کے بعد شوافع کے مستدلات کو بیان کیا گیا ہے، جس کے لیے (قالوا) یا (احتجّوا بہ) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

۵۔ امام قدوریؒ نے چوں کہ اس کتاب میں مناظرانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کے زمانے میں اپنے عروج پر تھا، اس لیے وہ ہر مقام پر شوافعؒ کے دلائل ذکر کرنے کے بعد احناف کی طرف سے بھرپور جوابات بھی دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ امام قدوری کا شوافع کے ساتھ مناظرہ چل رہا ہے، جس میں وہ دونوں مسلکوں کے دلائل بھی ذکر کر رہے ہیں اور حضرات شوافع کے مستدلات کے ٹھوس جوابات بھی دے رہے ہیں۔ اگر اس کی مثال دیکھنی ہو تو جلد: ۱، صفحہ: ۳۵۴-۳۵۴ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ جس میں اس مسئلے کی توضیح کی گئی ہے کہ فجر کی نماز کے دوران اگر سورج طلوع ہو جائے، تو احناف کے نزدیک نماز باطل ہو جاتی ہے، جب کہ امام شافعی کے نزدیک نماز باطل نہیں ہوتی؛ بلکہ بنا کر کے اسی نماز کو مکمل کیا جاتا ہے۔

۶۔ کتاب کا علم الخلاف کے موضوع پر ہونے اور مناظرانہ اسلوب اختیار کرنے کے باوجود امام قدوریؒ نے پوری کتاب میں کہیں ادب واحترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ امام شافعیؒ کی طرف کوئی طنزیہ نسبت یا خلاف ادب الفاظ ذکر نہیں کیا؛ بلکہ فقہائے شافعیہ کا تذکرہ بھی نہایت ادب واحترام کے ساتھ کیا ہے۔ پوری کتاب میں کہیں کوئی نامناسب تعبیر نہیں ملتی۔ اس سے امام موصوف کے مزاجی اعتدال، قلبی وسعت اور قلمی شرافت کا پتہ چلتا ہے۔ جو اصحاب قلم وقرطاس کے لیے سیکھنے کی چیز ہے۔

۷۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا اسلوب انتہائی آسان، عام فہم، سلیس، شیریں اور واضح ہے۔ مغلق تعبیرات سے مکمل گریز کیا گیا ہے۔

۸۔ کتاب کی نمایاں خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اس میں دلائل کا استقصا کیا گیا ہے۔ حتی الامکان احناف اور شوافع کے تمام دلائل ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب احناف اور شوافع کے مختلف فیہ مسائل اور دلائل کا ایک جامع انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے۔

۹۔ احناف پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، ہر اعتراض کے علمی جوابات دیے گئے ہیں، اور اس کے لیے علم الخلاف کے اصول کو اپنا کر تحقیقی انداز میں مسلک احناف کی ترجیح کی کوشش کی گئی ہے، اور علم الجدل والمنطق کا سہارا لے کر امام ابوحنیفہؒ کا بھرپور دفاع کیا گیا ہے۔

خلاصۂ بحث پوری کتاب کے مطالعے سے بنیادی طور پر تین باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں:

۱۔ فروعی اختلافات زحمت ومشقت کا باعث نہیں؛ بلکہ باعث رحمت ویسر ہیں۔

۲۔ فروعی اور مسلکی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کا ادب واحترام بیحد ضروری ہے۔

۳۔ فقہی اختلافات؛ بلکہ ہر نوع کے اختلاف میں تعصب وتشدد کے راستے کو اپنانے کی بجائے دلائل وشواہد کو بنیاد بنانا چاہیے، اور ان کی روشنی میں اپنے موقف کو مضبوطی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔

حواشی

دیکھیے: المصباح المنیر: ۱/۶۵۶۔

بخاری، رقم: ۱۷۔

دیکھیے: نھایۃ السؤل: ۱/۲۲۔

دیکھیے: المعجم الوسیط: ۰۳۷۔

بحوث فی الفقہ المقارَن: ۳۱۔

کشف الظنون: ۴/۲۷/۱، ابجد العلوم: ۲/۸۷۲۔

مستفاد: ماہنامہ دارالعلوم، جنوری: ۶۱۰۲ء، بہ عنوان: دور جدید کا فقہی ذخیرہ۔

تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: تاریخ بغداد: ۴/۷۷۳، وفیات الاعیان: ۷۹-۱/۸۷، سیر اعلام النبلاء: ۵۷۵-۷۱/۴۷۵۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ التربیۃ الاسلامیۃ: ۸۵۳۔

کتاب التجرید، المقدمۃ: ۱/۶۱۔

کتاب التجرید: ۶۲-۱/۵۲۔

مستفاد: مجلّہ علوم اسلامیہ ودینیہ، جولائی — دسمبر: ۶۱۰۲ء، بہ عنوان: کتاب التجرید میں امام قدوری کا منہج واسلوب۔

چند اہم مصادر ومراجع

۱۔ القرآن الکریم.

۲ صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، دارالقلم دمشق، 1400ھ/ 1980م.

۳۔ بحوث فی الفقہ المقارَن، د/ محمود ابولیل، د/ ماجد أبورخیہ، جامعۃ الإمارات العربیۃ المتحدۃ، العین، 1996 / 1997م.

۴۔ المصباح المنیر، أحمد بن علی المقری الفیومی، المطبعۃ الأمیریۃ، القاہرۃ، الطبعۃ السادسۃ، 1926م.

۵۔ کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون، محمد علی التھانوی، تصویر مکتبۃ کلکتا، الھند، 1862م.

۶۔ المعجم الوسیط، إبراہیم أنس، عبدالحلیم منتصر، عطیۃ صوالحی، محمد خلف اللہ أحمد، دارالأمواج، بیروت، 1992م.

۷۔ أبجد العلوم، صدیق بن حسن قنوجی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت: 1978م.

۸۔ کتاب التجرید، الإمام القدوری، تحقیق: د/ محمد أحمد سراج، د/ علی جمعہ محمد، دارالسلام، القاہرۃ: 2004م.

۹۔ تاریخ بغداد، الخطیب البغدادی، تحقیق: بشار عواد معروف، دارالغرب الإسلامی، 2001م.

۱۰۔ وفیات الأعیان، ابن خلکان البرمکی، تحقیق: إحسان عباس، دارصادر، بیروت، 1994م .

۱۱۔ سیر أعلام النبلاء، الذہبی، تحقیق: شعیب الأرناؤوط، بشار معروف مؤسسۃ الرسالۃ، 1982م.

۱۲۔ نھایۃ السول فی شرح منہاج الأصول، الإمام جمال الدین عبدالرحیم الآسنوی الشافعی عالم الکتب.

۱۳۔ تاریخ التربیۃ الإسلامیۃ، د/ أحمد شلبی، مکتبۃ الإنجلو، مصر، 1960م.

۱۴۔ التالیف الموسوعی والفقہ المقارن، وزارۃ الأوقاف والشؤون الدینیۃ، سلطنۃ عمان، الطبعۃ الثالثۃ، 1433ھ/ 2012م.

۱۵۔ مسائل فی الفقہ المقارن، د/ عمر سلیمان الأشقر، د/ ماجد أبو رخیہ، د/ محمد عثمان شبیر، د/ عبدالناصر أبوالبصل، دارالنفائس، أردن.

۱۶۔ الفقہ المقارن، حسن أحمد الخطیب، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، 1991م.

۱۷۔ قاموس الفقہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، زمزم پبلشرز، کراچی، اگست: 2007ء۔

۱۸۔ علم اصول فقہ-ایک تعارف، ڈاکٹر عرفان خالد، ڈھلّوں، شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد پاکستان، 2016ء۔

۱۹۔ مجلّہ علوم اسلامیہ ودینیہ، جولائی-دسمبر، ۲۰۱۶ء بہ عنوان: کتاب التجرید میں امام قدوری کا منہج واسلوب، از: بخت شید۔

۲۰۔ ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند جنوری: ۲۰۱۶ء، بہ عنوان: دور جدید کا فقہی ذخیرہ، از: مولانا سمیع اللہ سعدی

☆☆☆